در و دیوار

احمد ندیم قاسمی

در و دیوار

عظیم مظفر

جناب علی

پہلی بار

ناشر: چودھری افتخار علی

مقام اشاعت: مکتبہ اردو

مطبع: ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت دو روپے آٹھ آنے

نہایت پیارے دوست

نندلال کے نام

جو ملتان کا رہنے والا ہے

دہلی میں ملازم ہے، اور

جسے رہتک میں مکان الاٹ

ہُوا ہے۔

ندیم

فہرست

میں انسان ہوں

میں انسان ہوں، کلائی پر کھدے ہوئے ادم، ٹوپی پر ٹکے ہوئے چاند ستارے اور پہلو میں لٹکتی ہوئی کرپان کے باوجود میں انسان ہوں، میں ساری دھرتی کا باشندہ ہوں اور میں ایک ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں جو ستاروں اور پھولوں اور پانیوں میں بسا ہوا ہے، لیکن جس سے آج تک میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ میرا خمیر کسی ایسے مرکب سے اُٹھا ہے جس میں تلاش کا مادہ ضرورت سے زیادہ ملایا گیا ہے، میرا ادم، میرا چاند ستارہ اور میری کرپان میری اس ازلی تلاش کے کارنامے ہیں، میرے ارتقاء کی تاریخ میں آوارگی کے سوا اور کچھ نہیں، میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور گھاٹ گھاٹ سے واپس پلٹا ہوں۔ یہ پیاس ہی میری تلاش ہے اور زندگی ہے اور آخرت ہے۔ اور میں اس وقت بھی پیاسا ہوں۔ مکی کے بلند پودے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں " دھرتی کے لال! تو پیاسا ہے۔ مگر ہم تیری پیاس کیسے

بجھائیں ---- تو اس دن سے ہمیں سینچتا چلا آرہا ہے جب سورج کی کرنوں نے پہلی بار سرمئی رنگ کے دھندلکوں کو کترا تھا اور چشمے پھوٹے تھے اور جھرنے رینگنے لگے تھے ---- لیکن اس وقت تو ہمارے پاس اوس کے چند قطروں کے سوا کچھ نہیں - اور یہ قطرے بلندی پر ہیں، اور تو پستیوں میں ہے - ہم جھک نہیں سکتے، تو ابھر نہیں سکتا - اس لئے تو بھی بے بس ہے - اور ہم بھی بے بس ہیں، اور دھرتی کے لال! بے بسی ہی زندگی اور بے بسی ہی موت ہے" ---- اور اس کے بعد مکئی کے پودوں کی یہ سرگوشی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرسراتی چلی جاتی ہے! ---- وہاں تک جہاں عورتوں اور بچّوں کی تازہ لاشیں لہو کی ننھی ننھی تلیوں کے کنارے انسانیت کی ازلی پیاس کو مجسّم کئے پڑی ہیں - اور شائد وہاں تک بھی جہاں ایک معصوم بچّے کے ہونٹوں سے دودھ کی پیاس جمے ہوئے ان کی تہوں کے نیچے چمٹی ہوئی ہے ---- آج ساری انسانیت پیاسی ہے، اور میں بھی انسان ہوں، اس لئے میں بھی پیاسا ہوں -

میں اپنی جلتی ہوئی کٹی پھٹی زبان کی نوک سے ان پودوں پر سے اوس کا ایک ایک قطرہ چن لینا چاہتا ہوں لیکن اوس کے قطرے تو صرف شاعروں اور مصوّروں کی خوراک ہیں - ان سے روح شائد ہری بھری ہو جاتی ہو، مگر پیٹ خالی ہی رہتا ہے، اور میں نہ شاعر ہوں اور نہ مصوّر، میں انسان ہوں - اور میں پیاسا ہوں میری زبان اکڑ گئی ہے - میرے تالو سے جیسے ٹین کا دہکتا ہوا پترا چپک گیا ہے - میرے گلے کو چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں - پیاس میرے پھیپھڑوں کو لپیٹے اور سمیٹے جا رہی ہے - اور میری سانسیں رک رہی ہیں، اور میرے دماغ میں آبشار سے گر رہے ہیں اور مجھے گھونٹ بھر پانی کی تلاش ہے -

مکّی کے پودوں میں پھنسی ہوئی کیچڑ کو میں نے کئی بار چاٹا ہے۔ مگر میرے تالو اور زبان سے وہ قوت کیا ہوئی جو کیچڑ سے پانی نچوڑ لے، میں نے کوئلے سے تیل اور پتھروں سے آگ نچوڑی ہے۔ مگر اب میں کیچڑ سے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں نچوڑ سکتا، اور کیچڑ نے خشک ہو کر میرے ہونٹوں کو کمان کی زہ کی طرح تان رکھا ہے۔ چمکتے ہوئے سبز رنگ کی ایک مکھی بار بار میرے حلق تک گھوم آتی ہے۔ اسے نمی کی تلاش ہے اور میں ایک پیاسا انسان ہوں۔ اور مکّی کے پودوں کی جڑیں گن رہا ہوں —— ایک دو تین چار —— ان سب نے صرف ایک پودے کو سنبھال رکھا ہے۔ اور بلند پودا اپنے سر پر کلغی سجائے جھوم رہا ہے —— میں سوچتا ہوں اگر یہ جڑیں ایک ایک کر کے پودے کے قدموں تلے سے کھسکنے لگیں تو یہ میری طرح زمین پر آ رہے۔ میری طرح کیچڑ چاٹنے لگے۔ لیکن اس کی جڑیں مضبوط ہیں اس لئے یہ تنا کھڑا ہے اور میں زمین پر پڑا ہوں اس لئے کہ میری بنیادیں کمزور ہیں اس لئے کہ میں انسان ہوں —— اور میں پیاسا ہوں،۔

گاہے گاہے مجھے ابابیلوں کی آواز سنائی دے جاتی ہے، —— کہتے ہیں، ابابیل بادل کی محبوبہ ہے۔ ابابیل کی آواز آس پاس کے پربتوں کا رخ کر کے سوئے ہوئے بادلوں کو چونکاتی ہے۔ اور وہ صفیں باندھ کر اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں —— میں نہیں دیکھ سکتا ابابیلو۔ مگر محسوس کر سکتا ہوں کہ تم ٹوٹے ہوئے پروں کی طرح صاف ستھرے آسمان پر اڑانوں کے تانے بانے بنی رہی ہو۔ اور دائرے بنا رہی ہو۔ اور بادلوں کو بلا رہی ہو —— یونہی گاتی جاؤ اور پکارتی جاؤ کہ شاید اس لٹی ہوئی دھرتی کے کسی کونے کھدرے میں بادل کی کوئی دھجی تمہارے گیت۔ تمہاری

پکار کو سن لے اور تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہو اور جب وہ مکی کے اس کھیت پر آئے تو تھک ہار کر رو دے اور میں چڑیا کے پیاسے بچے کی طرح منہ کھول دوں اور بادل کے آنسو میرے پھٹتے ہوئے حلق کی آگ بجھائیں - اور خون کی ننھی ننھی تلیوں کے کنارے چھلک پڑیں اور جمے ہوئے لہو کی تہیں ڈھل جائیں اور کھلے ہونٹوں سے چمٹی ہوئی دودھ کی پیاس ان آنسوؤں ہی سے بجھ جائے —— اور جب یوں ہو تو میں اپنے گھر کی چھت میں گڑے ہوئے آزاد جھنڈے کو ہمیشہ کیلئے سرنگوں ہونے سے بچالوں!

جھنڈا پوری طرح نہیں گڑنے پایا تھا نا —— وہ ایک طرف جھک گیا تھا - جب انسانیت بم کے گولے کی طرح ایک چکرا دینے والے دھماکے کے ساتھ پھٹی ہے - تو وہ ایک طرف جھکا ہوا اپنا سینہ کوٹ رہا تھا -

صبح کیسی کنواری کنواری لگتی تھی اور گلیوں میں لوگ تیزی سے معبدوں کی طرف چپ چاپ لپکے جا رہے تھے - یہ میرے وطن کی آزادی کا پہلا دن تھا اور میں اس کے ماتھے پر سہرا باندھنے کیلئے آزاد جھنڈا اٹھائے چھت پر آگیا تھا - بہو نے جھنڈے کی تیاری کیلئے تین نئے ریشمی دوپٹے نذر کر دیئے تھے - اور پھر انہیں اس نفاست سے سیا تھا جیسے اپنے ننھے کا عروسی جوڑا تیار کر رہی ہے - رات بھر ہم سوچتے رہے کہ یہ جھنڈا کون گاڑے - بہو کہتی تھی - یہ میرے دوپٹوں سے بنا ہے اور اسے میں نے سیا ہے - بیٹا کہتا تھا کہ میں نے اس جھنڈے کی تخلیق کے لئے لاٹھیاں کھائی ہیں اور گیسیں پی ہیں - میں کہتا تھا کہ میرا سن دیکھو - میرے ارمان دیکھو - میرا حق دیکھو —— اور میرا معصوم پوتا پالنے میں پڑا ربڑ کی گڑیا سے سیٹیوں کی آوازیں نچوڑ رہا تھا —— فیصلہ ہوا کہ گجر دم سب سے پہلے جس کی آنکھ کھلے وہی جھنڈا گاڑے - اور میرے

بیٹے نے کہا تھا، "نیند کیسے آئے گی؟" ——— ہم سب ہنس دیئے تھے اور دیر تک جاگتے رہے تھے اور باتیں کرتے رہے تھے کہ اب ہم آپ ہی حکمران ہیں اور ہمارا ننھا آنے والے دور کا سالار ہے اور انگریز بھاگ نکلا ہے ——— اور پھر جوانی اونگھنے لگی، اور بڑھاپا جاگتا رہا۔

میں جب چھت پر آیا ہوں تو چاند مغربی دھند میں یوں اٹک سا گیا تھا جیسے مکئی کے بھٹے کا چھلکا ہوا میں اڑتے اڑتے خم کھا کر جم جائے ——— عجیب بات تھی کہ زمین پر ایک اتنا بڑا انقلاب جنم لے رہا تھا۔ اور چاند کا تار زرد اور مڑا تڑا سا تھا۔ اکا دکا ستاروں میں رقص کے بجائے اینٹھن سی تھی۔ اور مشرق میں چاند ایک مایوس مریض کی طرح افق پر کہنی رکھے جیسے کسی کربناک سوچ میں غرق تھا۔ جیسے وہ بھی میری طرح پیاسا تھا۔

میں نے جب جھنڈے کو ہوا میں بلند کیا تو وہ پھڑپھڑا کر لکڑی سے لپٹ گیا۔ ایک ٹڈا کواڑ کے ایک کونے میں سے پکارا۔ اور پھر جیسے اس کا گلا گھٹ گیا۔ کواڑ کے قریب ہی بندھی ہوئی بکری نیند میں ممیائی ——— عادت ہو جاتی ہے سب کے سب اتنی طویل تلاش کے بعد انسان نے اپنے آپ کو پایا ہے۔ مگر کچھ بھی تو نہیں ہو رہا ——— کوئی ہنگامہ۔ کوئی ہلچل ——— ارے کوئی طوفان ہی آجائے۔ کوئی زلزلہ ہی آنکلے۔ کہیں آگ ہی بھڑک اٹھے ——— کچھ تو ہو ——— خدا کے لئے کچھ تو ہو ——— جی میں آئی زور زور سے چیخنے اور گانے اور ہنہنانے لگوں اور دھرتی کو چونکا دوں اور نیند بھری آنکھوں کے سامنے اس جھنڈے کو نچادوں اور پکاروں ——— "ہم آزاد ہیں، ارے ہم آج سے آزاد ہیں۔ آؤ مل کر ایک نعرہ لگائیں جو مشرق و مغرب کے انسان فرد شوں کے محلوں میں

گھس کر اژدھے کی دو دھاری زبان بن کر ناچے اور پھنکارے" ___ کچھ تو ہو ___ خدا کے لئے کچھ تو ہو!

اور کچھ دور مجھے آگ کا ایک شعلہ دکھائی دیا جو لحہ بہ لمحہ سر بلند ہونے لگا اور پھیلنے لگا۔ اور پھر یوں ساکت و صامت ہو گیا۔ جیسے اس وقت میں بدبودار کیچڑ میں بے حس و حرکت پڑا ہوں، مکئی کے لمبوترے پتوں کے کنارے اوس کے قطرے کپکپا رہے ہیں اور میری زبان کی جڑ جیسے کسی مضبوط تار سے جکڑی جا چکی ہے۔ اگر میں زبان کو چبا کر اپنے ہی خون کے چند قطرے پی سکتا تو شاید مجھ میں اٹھنے کی قوت آجاتی اور میں اوس کے ایک ایک قطرے کو زبان کی نوک سے چن لیتا، لیکن اب تو یہ نوک تک غائب ہو رہی ہے اور زبان پھول کر میرے جبڑے میں پھنس کر رہ گئی ہے اور ہنح رہی ہے اور بار بار سبز پروں والی ایک مکھی اس پر بھنبھناتی ہوئی میرے حلق تک ہو آتی ہے ___ آگے نہ جانا کیونکہ میرے گلے سے نیچے عفونت اور کثافت کے اتھاہ غار ہیں جہاں تم میری انسانیت کے کھنڈروں میں الجھ کر رہ جاؤ گی، اور میں سراپا الجھاؤ ہوں کیونکہ میں انسان ہوں۔

لیکن اس روز میرے دل میں کوئی الجھن نہ تھی، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مجھے تازہ تازہ آسمان پر سے اتارا گیا ہے، عناصر میرے خدمتگذار ہیں۔ ساری دھرتی میرا گھر ہے۔ اور میرے شفاف ذہن پر ابھی تلاش کی کائی نہیں جمنے پائی، ___ سامنے منجمد سے شعلے میں نئی نئی صبح کے اجالے نے کہیں کہیں زردی کی دھاریاں دوڑا دی تھیں۔ مندر میں سنکھ بج رہا تھا۔ مسجد میں اذان ہو رہی تھی اور یہ ملی جلی آوازیں ہواہیں لہک لہک کر آپس میں لپٹ پٹ جاتی تھیں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے یہ آوازیں لغبگیر ہونے کے بعد ایک ابدی صدا میں بدل گئی ہیں۔ جیسے وہ

اب تک جاری ہیں اور قیامت تک جاری رہیں گی اور جیسے وہ بڑھ رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں اور میرے قریب آ رہی ہیں —— مجھے تھپک رہی ہیں —— مجھے چونکا رہی ہیں —— اور پھر —— اور پھر جیسے مجھے جکڑ رہی ہیں۔ نوچ رہی ہیں، جھنجھوڑ رہی ہیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون ہیں؟ یہ کہاں سے آئے ہیں؟" —— میں چلّایا —— گلی میں ایک شخص سرپٹ بھاگتا ہوا گذرا وہ کہہ رہا تھا "یہ انسان ہیں یہ دھرتی کے کلیجے سے نکلے ہیں اور یہ دھرتی کا کلیجہ چبانے چلے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں لہو اور ہاتھوں میں خون آلود ہتھیار ہیں اور ان کے دانتوں کی ریخوں میں انسانی گوشت کے ریشے ہیں"۔

"تم غلط کہتے ہو"۔ میں چلّایا "آج ہی تو انسان نے اپنے آپ کو پایا ہے، وہ آج ہی اپنے آپ کو کیسے کھو سکتا ہے، جس صبح کو اپنے قریب لانے کیلئے اس نے اپنے بچّوں کو ہنسی خوشی پھانسی پر چڑھ جانے کی اجازت دے دی۔ اور جس دن کے انتظار میں اس کے پیارے فرزندوں نے کال کوٹھڑیوں میں اپنی زندگی کی بہاریں گنوا دیں۔ وہ یہی صبح تو ہے۔ اور اس صبح کو یہی انسان اپنے ہی خون اور گوشت کے ریشوں سے ملوث کرنے نکلا ہے! نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو، یہ مسرّت کا ہنگامہ ہے اور ہر ہنگامہ لہو کا پیاسا نہیں ہوتا۔ آج ہنگامے کا مفہوم بدل چکا ہے" —— اور میں نے جھنڈے کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔ "آج دو سو سال کے ہر پرانے مفروضے کا مفہوم بدل چکا ہے، —— آج ہمارا جھنڈا تک بدل چکا ہے"۔

جھنڈے کا نیا نیا ریشم بے قرار ہو کر سرسرانے لگا جیسے کہہ رہا ہو "آہستہ بولو بھئی۔

مجھے آزادی کے قدموں کی چاپ سن لینے دو۔ میں صدیوں سے سرنگوں ہوں۔ مجھے سر بلند ہو کر دھرتی کے ان کناروں کو دیکھنے دو جہاں آج جشن منائے جا رہے ہیں، اور تو پیں میری سلامی اتار رہی ہیں، اور لوگ میرے ارد گرد ناچ رہے ہیں۔ اور گا رہے ہیں۔"

ایک دم بہت سے نعرے بلند ہوئے، گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی، لوگ کھڑکیوں اور روشندانوں سے کودنے لگے، دھرتی آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں آگئی۔ آس پاس سے اٹھا پٹخ اور واویلا اور چیخوں اور کراہوں کی آندھی اٹھنے لگی، اور میں نے وحشت زدہ ہو کر جھنڈے کو چھت میں گاڑ دیا۔ میں سیڑھی کو بھول کر منڈیر پر سے لٹک کر اترنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ بند کواڑوں پر ان گنت ہتھوڑے اور پتھر برسے، اور پھر چنگھاڑتے ہوئے ہجوم نے آن کی آن میں دونوں کواڑوں کو اس زور سے دھکیلا کہ بالائی حاشیے کی اینٹیں لڑھکتی ہوئی دالان کے دوسرے سرے تک بکھر گئیں کواڑ دھڑام سے گرے اور بکری زمین اور لکڑی کے درمیان پچک کر رہ گئی۔ وہ دو ایک بار تڑپی۔ دو ایک بھیانک آوازیں نکالیں۔ اس کے تھنوں سے دودھ اور لہو گھل مل کر رسنے لگا اور پھر وہ زبان کو چیتھڑے کی طرح لٹکا کر بے حس ہو گئی۔

اور میں منڈیر پر ساکت و صامت بیٹھ گیا ——— جیسے خاص اہتمام سے ٹکٹ خرید کر سرکس کا تماشہ دیکھنے آیا ہوں۔

کواڑ کے گرتے ہی میرا بیٹا ہڑبڑا کر اٹھا مگر ایک لمبوترے نیزے میں پرو دیا گیا۔ اور پھیلے ہوئے نتھنوں، اور جھکی ہوئی بھوؤں والے ایک انسان نے دوسرے انسان کو مخاطب کیا "یہ جھنڈا کیسا رہے گا!" ——— خوفناک قہقہوں کے پھریرے میں میرا بیٹا چرخی کی طرح ٹانگیں گھماتا، ہاتھ پٹختا، بل پہ بل کھاتا، کراہا۔ یہ جھنڈا

پہلے تم نے گاڑا، مبارک ہو، مبارک ہو۔"

بہو نے اچھل کر اپنے شوہر کو نیزے سے نوچ لینا چاہا مگر اکھٹے بہت سے لوگوں نے اسے جکڑ لیا اور اس کی قمیص پھاڑ کر پھینک دی۔ وہ ان کی گرفت سے نکل کر گوشت کی ایک گٹھڑی کی طرح لڑھکتی ہوئی دالان کے پرلے کونے تک چلی گئی۔ اور باہوں میں اپنا سینہ چھپانے لگی۔ مگر انسان نے تو بڑے بڑے پہاڑوں میں راہیں تراشی ہیں، باہوں کی ڈھالیں اس کے سامنے کیسے ٹھہر سکتیں، اسے اٹھا کر ہاتھوں اور پاؤں سے پکڑ کر سیدھا تان لیا گیا، اور پھر ایک شخص نے آگے بڑھ کر مڑے ہوئے خنجر سے اس کی ایک چھاتی کاٹ کر اوپر اچھال دی جو دھب سے بلبلاتے ہوئے ننھے کے منہ پر گری۔ اور پھر زمین پر آ رہی۔ ایک شخص نے اسے ایڑی سے مسلتے ہوئے کہا۔" دوسرا گنبد بھی اکھیڑ لو"——— اور اب میری بے جان بہو کی دوسری چھاتی تراشی گئی، مگر اس کو ہوا میں اچھالنے کا تکلف نہیں کیا گیا۔ بلکہ خدا کے ایک خلیفہ نے اسے ننھے کے منہ پر کھینچ مارا۔

اور میں سرکس کا تماشہ دیکھتا رہا۔

میں ازل سے ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ میں نے ان آنکھوں سے انسانوں کو انسانیت کا لہو چاٹتے دیکھا ہے میں نے کھوپڑیوں کے ہار اور مینار بنتے دیکھے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بیٹوں نے ماؤں کے پیٹ پر لات ماردی، اور بھائیوں نے بہنوں کی مانگوں کا سیندور دھو کر پی لیا، میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں ایک خاموش تماشائی ہوں میں ساری کائنات کا دولہا ہوں، میں انسان ہوں۔

میں نے اپنے بیٹے کو نیزے کی نوک پر تشنجی عالم میں ہاتھ پاؤں گھماتے دیکھا

اور پھر جیسے نئی نئی صبح کی ساری سفیدیاں اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں میں اتر آئیں۔ وہ ایک بار کمان کی طرح مڑ کر سیدھا ہوا اور باہوں کو بے قراری سے پٹخ کر بے حس ہو گیا۔

اور میں تماشا دیکھتا رہا۔

میں نے بہو کے جسم پر سے آدمیت اور نسوانیت کے ملبوں کو اکھڑتے دیکھا جن سے بڑے بڑے اوتاروں بزرگوں اور گروؤں نے زندگی کا رس چوسا تھا۔ جس سے پھوٹتی ہوئی دودھ کی دھاروں میں ماتا تھی اور طہارت تھی اور زندگی تھی ——— اور انسانیت کی یہ تخلیق گاہیں جب نسوانیت کے مقبرے بن کر میرے معصوم پوتے پر گریں، تو انہوں نے دودھ کے پیاسے ہونٹوں پر لہو نچوڑ دیا۔ اور میرے اندر انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ اور جھکا ہوا آزاد جھنڈا میرے سر پر برابر تالیاں سی بجاتا رہا اور دھواں گہرا ہوتا گیا اور نعروں کے شور میں شدّت آتی گئی۔

اب ہجوم نے میرے معصوم پوتے کا رخ کیا۔ تجویز ہوئی "دیوار پر پٹخ دو"۔ انسانی مجلس دستور ساز کا دوسرا رکن بولا "ٹانگوں سے پکڑ کر چیر دو۔ روئی کی طرح نرم تو ہے ہی"۔

مجلس کا صدر میان سے چھری نکال کر پکارا "چولھا موجود ہو تو کباب دھوپ میں نہیں بھونا کرتے"۔

اور خون آلود چہرے والا بچّہ جس کا ایک ہاتھ تو ماں کی کٹی ہوئی چھاتی پر تھا اور دوسرے ہاتھ نے ربڑ کی گڑیا کو جکڑ رکھا تھا سمٹ کر ہٹا اور ربڑ کی گڑیا بلبلا اٹھی ——— جھنڈے نے جیسے اپنی چھاتی کوٹ لی اور میں نے چیخ کر کہا "نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ نیا انسان ہے یہ مستقبل کا وارث ہے۔

اسے ایک نئی دنیا کو جنم لینا ہے! — اس کی قدر کرو، اس کی پوجا کرو، اسے سلامی دو۔"

اور تنی ہوئی چھری نے نئے انسان کو سلامی دی اور ادھر لمبا نیزہ میرے بیٹے کے پیٹ پر لات رکھ کر کھینچا گیا۔ نیزے کی انی انتڑیوں کا ایک ڈھیر باہر گھسیٹ لائی اور پھر سرخ انی جو ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی میں شعلے کی زبان بن گئی تھی، مجھ پر جھپٹی اور میری ران کو کاٹ کر پھر سے شعلے کی زبان بن گئی۔ میں دھم سے نیچے آ رہا۔ اٹھا تو گوشت کا ایک ٹکڑا میری ران کے ساتھ بھیگی ہوئی دھجی کی طرح لٹک رہا تھا۔ مگر میں اپنے پوتے کی طرف لپکا چلا گیا، اسے اٹھانے ہی والا تھا کہ چھری نے اس کی گردن میں دھنس کر نئے نظام اور نئے انسان کو ایک سلامی دی وہ تڑپ کر زمین پر آ گرا۔ اور ربڑ کی گڑیا اس کے ایک پہلو تلے دب کر بلبلا اٹھی!

اپنے بیٹے کی انتڑیوں پر سے پھسلتا ہوا میں ننھے پر جا گرا اور پھر اسے اٹھا کر گرے ہوئے کواڑوں تک پہنچا ہی تھا کہ نیزے نے میری پنڈلی ادھیڑ ڈالی۔ میں چکرا کر گرا اور میرا پوتا گھوم کر اپنی ماں کے لہولہان سینے پر آ رہا — حیرت ناک تیزی اور مستعدی سے میں نے نیزے کو پنڈلی میں سے کھسوٹا اور بچے کو ایک بازو سے کھینچ کر باہر گلی میں آ گیا، اور پھر وہاں سے بھاگا، بچے کو میں نے سینے سے چمٹا رکھا تھا، چار طرف چیخوں اور قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور معبد جل رہے تھے۔ اور آس پاس ابھرتے ہوئے دھوئیں میں دہکتی ہوئی لکڑیاں چٹکیاں سی بجا رہی تھیں، اور ننھے کی ناک اور منہ سے خون برس کر آس پاس جم گیا تھا — اور میں بھاگتا چلا گیا۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا، کسی نے مجھے پکارا نہیں، کیونکہ انسانوں کا شکار ہرن کا

شکار نہیں کہ ایک ہی ہرن کے تعاقب میں جنگل کا جنگل چھان ڈالا جائے، یہاں تو قدم قدم پر انسان ملتے ہیں، جو ہرنوں کی طرح برق رفتار بھی تو نہیں ہوتے۔

اب میں کھیتوں میں آگیا تھا، سورج نے مکئی اور باجرے اور جوار کے کھیتوں پر سونا چھڑک دیا تھا، اور ہوا ہولے ہولے اٹھلا رہی تھی۔ اور آسمان صاف ستھرا تھا۔ اور درختوں پر چڑیاں بول رہی تھیں اور پدے پھدک رہے تھے اور بہت اوپر ابابیلیں بادلوں کو پکار رہی تھیں، اور دھرتی جس دولہا کے لئے سج رہی تھی، وہ میرے سینے سے لگا نہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ملائم بال اُس کے ماتھے پر لٹک آئے تھے، بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹوں پر نیندوں نے دم توڑ دیا تھا۔ ناک کے بانسے اور گالوں اور پلکوں اور ہونٹوں کے خموں پر خون جم گیا تھا .... اور پھر مُجھے محسوس ہؤا جیسے اُس کے ہونٹ ماں کا دودھ مانگ رہے ہیں۔

دھرتی کی ماتا لٹ چکی ہے میرے ننھے اور ماں کی چھاتیاں خشک ہو چکی ہیں، اب ان چھاتیوں سے دودھ نہیں پھوٹے گا۔ اب ان میں سے دہکتا ہؤا لہو اور کھولتے ہوئے آنسو بہیں گے۔ اور ان کی جگہ وہ ناسور لے لیں گے، جن سے پیپ رِسے گی —— تم اس دنیا میں قطعی ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے ہو —— کیسی عجیب سی سادگی ہے تمہاری کہ تم باوجود اس اجنبیت کے دودھ کے پیاسے ہو —— البتہ میں تمہارے لئے کہیں سے پانی ضرور تلاش کروں گا۔

اور وہاں ایک جھاڑی کے قدموں میں بچے کو لٹا کر میں نے اٹھنا چاہا تو تلملا کر رہ گیا، ران اور پنڈلی سے اُبلتے ہوئے خون سے میری ٹانگ اکڑ رہی تھی۔ اور آنکھوں کے سامنے چکراتے ہوئے سرخ ستاروں کے ہجوم اُلجھ اُلجھ کر رہے تھے

اور سمت کا احساس ہٹ رہا تھا ——— بچے کے ہونٹوں پر اب تک دودھ کی خاموش پکار تھی ———

میں رینگنے لگا ——— میری ہر حرکت پر زخم لہو کے چلو انڈیل دیتے تھے۔ مگر میں رینگتا چلا گیا، کہ شائد دھرتی کے کسی مقام پر مجھے پانی کی ایک بوند دکھائی دے جائے، شائد اس کا کلیجہ ابھی پوری طرح خشک نہ ہوا ہو ——— شائد ——— شائد ——— اور میں اس امید پر رینگتا چلا گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میرا رُخ کدھر ہے، ——— میرے دماغ پر بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ ایک بار انسانیت کی آخری یادگار کے پیاسے ہونٹوں کو تر کر سکوں۔ ——— شائد خون کی تہوں کے نیچے زندگی کی کوئی رمق باقی ہو اور یہ رس چمک اٹھے، اور نیا انسان زندہ ہو جائے، اور ان دیاروں کو آباد کرے جہاں شعلے ناچے ہیں اور دھوئیں نے چُٹکیاں بجائی ہیں، ان کھیتوں کی نگرانی کر سکے جہاں اچھوتے جسموں کو دبوچا اور نوچا گیا ہے۔ ان راہوں پر گیت گاتا ہوا گزر سکے، جنہیں مقتولوں کی صورت دے دی گئی ہے ——— شائد اس کے دم سے انسانیت اپنے آپ کو پہچانے اور آنکھوں میں اُترا ہوا خون اپنے اصلی مقام کی طرف لوٹ کر صحت مند دھڑکنوں میں بدل جائے ——— شائد ——— شائد ——— اور میں اس امید پر رینگتا چلا گیا۔

میں مکئی کے اس کھیت تک رینگ آیا۔ یہاں داخل ہوتے ہی مجھے عورتوں اور بچوں کی تازہ تازہ لاشیں نظر آئیں، دبھی دبھی بچے ماؤں کی کٹی ہوئی رانوں میں دبکے پڑے تھے اور مائیں عفت کے بجھے ہوئے چراغوں کو خراش زدہ بازوؤں سے ڈھانپے جیسے کہہ رہی تھیں ——— کیا آدم کو اس لئے زمین پر اتارا گیا تھا؟ کیا فرشتوں

کے والہانہ سجدے کی یہی قیمت تھی؟ کیا ابلیس سچ مچ بغاوت کا مرتکب ہوا تھا؟ کیا یہی وہ آزادی ہے، جس کے ہمارے شاعروں نے گیت گائے اور ہمارے رہنماؤں نے قسمیں کھائیں ——— اور کیا یہی وہ انسان ہے جس کی خاطر آسمانوں پر ستاروں کی قندیلیں جلائی گئیں ——— اور زمین پر پھولوں کے فرش بچھے اور ہواؤں میں خوشبوئیں رچیں اور جھرنے گنگنائے اور سمندروں نے مرمریں سیپیاں نچھاور کیں اور سنہری خوشوں میں زندگی نے جنم لیا ——— اور خدا نے اس کے پاس اوتار، پیغمبر اور گرو بھیجے کہ یہ اور سنورے اور نکھرے اور کائنات کو دلہن بنا دے ——— اور دھرتی سدا سہاگن رہے ——— اور کیا دھرتی کا سہاگ یہی ہے کہ اناج پیدا کرنے والے پودوں کی اوٹ میں ماؤں اور بہنوں کے جسموں سے ان کی طہارت کو کھسوٹ کر خاک پر پٹخ دیا گیا ——— اور بچوں کی ملائم جلد پر خنجروں کی دھاریں آزمائی گئیں۔ اور بوڑھوں کی ہڈیوں کو سوکھی لکڑیوں کی طرح توڑا گیا اور جوانوں کی انتڑیاں درختوں پر لٹکا دی گئیں ——— اور کیا باوجود اس کے زمین پر اب تک کوئی غیرت مند انسان زندہ ہے؟ کیا مشرق و مغرب میں کسی ایسے انسان کا سراغ اب بھی مل سکتا ہے، جو ممتا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہو ——— ؟ اور کیا تم انسان ہو ———

تم جو ایک ننھی جان کو ایک جھاڑی کے قدموں میں پھل کی گٹھلی کی طرح بے کار ... ... سمجھ کر پھینک آئے ہو۔ اور اس ویرانے میں پانی کی تلاش میں ہو ——— تم جو اس صحرا کا آخری نخلستان اپنے سینے سے لگائے بھاگے تھے ——— تم پانی کی تلاش میں ہو؟ ——— مگر کس لئے؟ ——— انسانیت

کے آخری وارث کے لئے ؟ —— تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ خود اپنی پیاس بجھانے کے لئے تمہیں پانی کی تلاش ہے!

اور معاً جیسے زمین کے ذرّے ذرّے سے پانی پانی کی "پکار اٹھی" میرا حلق چرانے لگا" اور زبان پر جیسے خشک جھلی منڈھ گئی —— "پانی پانی" میں کراہتا ہوا رینگنے لگا —— اور رینگتے رینگتے یہاں تک آ گیا، مکئی کے ان پودوں کے سائے میں جنہیں بہت سی جڑوں نے مل کر سنبھال رکھا ہے" پانی پانی" میں کراہتا رہا۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کٹی ہوئی چھاتیاں اور اُبلی ہوئی انتڑیاں اور خون آلود چہرے —— تمام ایک سبب کا ناگزیر نتیجہ تھے، اور جیسے ساری دنیا میں ایک میں ہی مظلوم ہوں —— اور اگر مجھے پانی کا ایک گھونٹ مل جائے تو میں ایک آن میں ساری کائنات پر حاوی ہو جاؤں —— اور ایک بہت اُونچی چوٹی پر ایک بہت اونچا تخت بچھا کر ایک ایک انسان کو اپنے حضور بلاؤں اور اس کی کھوپڑی کو چٹخا کر اس کا گودا نگل جاؤں، اور ہنستا جاؤں، اُس کی پسلیاں توڑ کر اور اُس کے دل کو نچوڑ کر اپنی ازلی و ابدی پیاس بجھاتا رہوں اور قہقہے لگاتا رہوں —— حتٰے کہ اس دھرتی پر کوئی انسان باقی نہ رہے —— اور پھر میں اس زور سے چیخوں کہ پھیپھڑے میرے حلق سے گوشت کے ریزوں کی پھوار بن کر نکل جائیں —— اور پھر میں اس چوٹی پر سے نیچے اندھیری کھاڑیوں میں کود جاؤں —— اور مشیّت ہاتھ ملتی رہ جائے اور ابلیس کو واپس آسمانوں پر بلا لیا جائے۔ اور مٹی کے بُت بنا کر اُن میں پھڑپھڑاتی ہوئی روحوں کو مقید کرنے کا کھیل پھر نہ دہرایا جائے۔

اور میں اس سوچ میں غرق یہاں مکئی کے ان بے بس پودوں میں گھرا ہوا پڑا

ہوں، مجھے گھونٹ بھر پانی کی تلاش ہے۔ بادلوں کی محبوبائیں کہیں دور چلا رہی ہیں۔ چمکتے ہوئے سبز پروں والی مکھی میرے حلق تک جاکر اور مایوس ہوکر پلٹ جاتی ہے، کیچڑ نے ایک کنجوس کی طرح اپنی نمی کو دبوچ رکھا ہے، دھوپ کی وجہ سے مکئی کے جھکے ہوئے پودے اور اوپر اٹھے جا رہے ہیں، —— مجھے مکئی کے ان پتوں سے، اس کیچڑ سے، کسی بھولے بھٹکے انسان سے، آسمانوں سے، خدا سے صرف ایک گھونٹ پانی چاہئے، —— مجھے پانی کی تلاش ہے، مجھے ایک نئی زندگی کی تلاش ہے، مگر میری تلاش بے کار ہے، کیونکہ میں خدا کی محبوب ترین مخلوق ہوں —— میں انسان ہوں ؏

نیا فرہاد

گاؤں سے گزرتے ہوئے ایک وردمند مسافر نے چوپال پر حقہ پیتے ہوئے کہا۔

"اس وقت لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر مُسلمانوں کی لاشیں بچھا دی گئی ہیں، اور ان پر سے سکھوں اور ہندوؤں کی موٹریں اور لاریاں گزر رہی ہیں، اور ان پر کودا اور ناچا جا رہا ہے۔ اور لارنس باغ میں ایک بہت بڑی دیگ گاڑ دی گئی ہے جس میں تیل کڑکڑا رہا ہے اور شیر خوار مسلمان بچے تلے جا رہے ہیں، اور وہ لاہور کی بڑی مسجد ہے نا۔ اس کے چاروں میناروں پر ہنومان کے بت رکھ دیئے گئے ہیں اور ان بتوں کے پہرے دار بے شمار سکھ اور ہندو ہیں جن کے ہاتھوں میں بم اور بندوقیں ہیں۔ اور ہونٹوں پر گالیاں ہیں اور اتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے کہ پچھلے جمعہ کی رات کو لاہور کے آسمان پر آگ بھڑکتی دیکھی گئی۔ اور پھر یہ آگ اللہ کا لفظ بن کر غائب ہو گئی۔"

"اور مسلمان عورتیں؟" ایک نوجوان نے دم بخود ہجوم کی نمائندگی کی۔

"مسلمان عورتیں؟" مسافر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔" اس بارے میں تم نہ ہی پوچھتے تو بہتر تھا میرے دوست، اس بارے میں تو میں صرف یہ کہہ سکوں گا کہ دنیا کے تمام مسلمان نوجوانوں کو اپنے منہ پر توے کی کالک مل لینی چاہیئے"۔ اور یہ کہہ کر اس نے پگڑی کے ایک پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور چوپال سے اُتر گیا۔

دیر تک چوپال پر ایک المناک خاموشی طاری رہی، مبہوت چہرے رنگ بدلنے لگے، جمی ہوئی پتلیوں میں آگ بھڑکنے لگی اور ہونٹوں پر آناً فاناً پپڑیاں ابھر آئیں، اچانک جعفر تن کر اُٹھا اور گرجا۔" سوچ کیا رہے ہو بزدلو، اپنے بھائیوں کے خون اور اپنی بہنوں کی بے عزتی کا یہیں بدلہ لو، چلو، اٹھو، اٹھو!"

اور کچھ دیر کے بعد گاؤں میں ایک ہڑ بڑ مچ گیا۔ جہاں صرف دو چار تنوروں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہاں جگہ جگہ الاؤ بھڑک اٹھے، جلتی ہوئی لکڑیاں چٹخنے لگیں، بچے غیر مسلموں کی دکانیں لوٹنے لگے، بوڑھے چوپال اور مسجد کی چھت پر چڑھ کر گنتی میں مصروف ہو گئے" اس وقت تیرہ جگہ آگ بھڑک رہی ہے"۔ عورتیں اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھ کر موت کے خوف سے بھاگتے اور چیختے ہوئے غیر مسلموں کو دیکھنے اور مسکرانے لگیں اور نوجوان دیواریں پھاند پھاند کر اور دروازے توڑ توڑ کر گھروں کے اندر کودنے، چھرے بھونکنے، چھاتیاں نوچنے آگ لگانے اور مال چرانے لگے، زندگی اور موت میں دوڑ جاری تھی، اور دردمند مسافر سرکاری ذخیرے کے ایک چشمے کے کنارے ایک درخت کے سائے میں لیٹا "ماہیا" گا رہا تھا۔

جعفر جلا الارام کے گھر سے خون آلود چھرا اٹھائے اور ریشم کے تھان اٹھائے نکلا،

چند قدم چلا، رک کر تھان گلی میں پٹخ دیئے اور پھر پلٹ کر پکارا۔ "فقیرے، یہ کل آٹھ تھان ہیں، دو تمہارے اور چھ میرے، میری بیوی تک پہنچا دے اور اس سے کہنا کہ آج ہم مرغا کھائیں گے — یہ پڑے ہیں تھان، میں ذرا سردار شنکر سنگھ کے مزاج پوچھ آؤں۔" قہقہے بلند ہوئے اور جعفر ایک تنگ گلی میں مڑ گیا، جس کے سرے پر ایک مکان جل رہا تھا۔ ابلتے ہوئے دھوئیں سے چیخیں لپٹی ہوئی تھیں اور سردار شنکر سنگھ نے جلتے ہوئے مکان کی چھت سے چھلانگ لگا کر اپنی ریڑھ کی ہڈی توڑ لی تھی اور اپنی کھوپڑی کا بھیجا بکھیر دیا تھا۔ وہ شنکر سنگھ کی لاش میں چھرا گھونپنے کو رکا ہی تھا کہ ملحقہ مکان کی چھت سے آواز آئی — "جعفر خاں!"

جعفر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک لڑکی منڈیر کی آڑ میں دبکی بیٹھی تھی، جعفر کو صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں، لیکن وہ اسے پہچان گیا۔ چھرے والا ہاتھ پیچھے لے جا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس کے چہرے کے تنے ہوئے خطوط میں معصومیت کی نرمی آ گئی، اُس کی وحشت سے لبریز آنکھوں میں بھیگتی ہوئی رات کے ستاروں کی ٹھنڈک بھر گئی، اور ہونٹ لرز اٹھے — "شانتی" وہ جیسے زیرِ لب بڑبڑایا — اور پھر تیزی سے بلند آواز میں بولنے لگا "شانتی! تم اتر آؤ، تم میرے پاس آ جاؤ، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، سب جانتے ہیں کہ تم شانتی ہو۔ آ جاؤ، یہیں سے لٹک آؤ، میں تمہیں یوں محفوظ رکھوں گا جیسے ڈبیا میں موتی، آ جاؤ۔"

"جعفر" — شانتی نے اپنے اندازِ نشست و گفتار کو بدلے بغیر کہا "تمہارے چھرے پر خون جما ہوا ہے، اور تمہاری آستینیں سرخ ہو رہی ہیں، اور وہ سامنے میرا تایا شنکر سنگھ پڑا ہے، جس نے ایک بار کبڈی کے میلے میں تمہیں اپنے کاندھوں

پر بٹھا لیا تھا اور بھاگتے ہوئے سارے میدان میں گھوما تھا۔ اور اس کا مکان ـــ"

شانتی نے ایک بار کہیں پیچھے دیکھا اور بولی "مجھے بھی ایک ماں نے جنا ہے ہے جعفر، اور میں بھی ایک باپ کی بیٹی ہوں، میرے بھی دو ننھے ننھے بھائی اور اور ایک ذرا سی بہن ہے، میں بھی انسان ہوں، ـــ وہ سب اسباب کی کوٹھڑی میں ٹرنکوں کے پیچھے دبکے پڑے ہیں اور شاید گھٹ کر مر بھی چکے ہوں۔ اور تمہارے بھائی ہمارا دروازہ توڑ رہے ہیں اور اندر پتھر پھینک رہے ہیں، اور میں یہاں کتنی دیر سے بیٹھی ہوں۔ میں تمہاری راہ تک رہی تھی، میں جانتی تھی تم ضرور آؤ گے۔ مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ کیا مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں، وہ بھی تو مسلمان ہی تھے جنہوں نے ہمارے گرو جی کی آمد پر دھرم شالہ کیلئے اپنی مسجد کی لالٹین بھیجدی تھی، اور تم بھی مسلمان ہو جو سکھوں ہندوؤں پر صرف اس لئے چڑھ دوڑے ہو کہ وہ تمہارے خدا کو کسی دوسرے روپ میں دیکھتے ہیں، میں بڑی تسلی سے آہستہ آہستہ بول رہی ہوں، اس لئے کہ جو ہونے والا ہے وہ ضرور ہوگا، یہ میرے پاس بھی کرپان ہے اور جب ہمارے گھر کا دروازہ ٹوٹا تو اس کرپان سے میں اپنا سینہ پھاڑ لوں گی، لیکن مجھے تم سے صرف یہ پوچھنا تھا کہ کیا تمہارے لئے یہ سب کچھ مناسب تھا؟ کیا تمہیں شرم نہیں آتی؟ کیا تم لوگوں کو جنت ایسے ہی کاموں کے بدلے ملتی ہے؟ اور کیا واہگرو تمہیں معاف کردیں گے؟"

یہ پنگھٹ کی رانی بول رہی تھی، یہ وہی تھی جس کی کانسی کی گاگر دھوپ میں چمکتی تھی تو جعفر کہا کرتا تھا "شانتی چاند اٹھائے لئے جا رہی ہے۔" اور جب وہ چمکتا ہوا پانی گاگر میں بھرتی تھی تو جعفر کہتا تھا "شانتی چاند میں چاندنی بھر رہی

ہے۔" اور جب وہ گاگر اُٹھائے چلتی تھی تو جعفر کہتا تھا" کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ شانتی ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے اور میں اُسے یوں ہی دیکھتا رہوں اور سورج قیامت تک یہیں جما رہے، اور گاگر چمکتی رہے اور پانی اُچھلتا رہے۔"

یہ وہی جادوگرنی تھی جس کو جعفر نے دو برس تک تقریباً ہر روز دیکھا، گھر سے بڑے بڑے نرم الفاظ سوچ کر پنگھٹ والی گلی کے موڑ پر جا کر بیٹھ جاتا اور ان لفظوں کو دہراتا رہتا، لیکن جب شانتی ادھر سے گذرتی اس حالت میں کہ ایک ہاتھ نے گاگر کو تھام رکھا ہوتا اور دوسرا ہاتھ دوپٹے کو سینے پر سنوارتا رہتا اور اس کی بھوؤں کے عین درمیان سلیٹی رنگ کی ایک بندیا اس کے گورے چہرے پر شفق میں گھلی ہوئی کرنیں دوڑا رہی ہوتی، تو جعفر اُٹھنے کی کوشش میں بیٹھا رہ جاتا اور بولنے کی کوشش اس کی زبان گنگ ہو جاتی، اور جب شانتی دوسری گلی میں غائب ہو جاتی جب بھی وہ اسی طرح بیٹھا رہتا اور جب لوگ اُسے ہر روز یوں بت کی طرح بیٹھا دیکھتے تو کہتے "اول اول مرگی یونہی شروع ہوتی ہے۔"

جعفر کو شکایت تھی کہ شانتی نے ان دو برسوں میں اُسے ایک بار بھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ اور وہ خوش تھا کہ شانتی اس کے قریب سے گذرتے ہوئے گھونگھٹ نہیں نکالتی، اور اگرچہ اس کی نظریں کہیں دور جمی رہتی ہیں، لیکن وہ جعفر کی نظروں کے لئے کوئی ڈھال تو استعمال نہیں کرتی تھی،

اور اب وہی شانتی اُسے مسلسل دیکھ رہی تھی، اس سے باتیں کر رہی تھی، اُسے شرمندہ کر رہی تھی، اور وہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں والوں کو فساد

پر اُکساتے ہوئے اُسے یہ خیال کیوں نہ آیا کہ اسی گاؤں میں شانتی بھی رہتی ہے، جس کا باپ بڑھاپے کی وجہ سے دکان پر نہیں بیٹھ سکتا، اور جس کی ماں گاؤں کے بڑے بڑے گھروں میں کپڑے کے تھان اور گڑ کی گٹھڑیاں اُٹھائے جاتی ہے اور یوں اس چلتی پھرتی دکان سے جو فائدہ ہوتا ہے اُس سے شانتی اور اپنے دوسرے بچوں کا پیٹ بھرتی ہے، اس نے یہ کیوں نہ سوچا کہ حضرت پیر دستگیر کے عرس پر شانتی کی ماں گاؤں کے بچوں میں مٹھائیاں بانٹتی ہے اور عاشورہ کے روز وہ شربت کا اتنا بڑا مٹکا مسجد میں بھیج دیتی ہے اور آخر اس نے یہ کیوں نہ دیکھا کہ شانتی نہ رہی تو سارا پنگھٹ اُجڑ جائے گا۔ گلیوں کے موڑ اجڑ جائیں گے، ساری دُنیا اُجڑ جائے گی ـــــ ساری دُنیا اُجڑ جائے گی!

وہ لپک کر آیا اور کود کر منڈیر کو اپنی گرفت میں جکڑنا چاہا، مگر کامیاب نہ ہو سکا" پھر ایک ہزیمت خوردہ انسان کی طرح نہایت لجاجت سے کہنے لگا "شانتی! نیچے آجاؤ یہاں میرے کندھوں پر پاؤں رکھ کر اُتر آؤ۔ میں تمہارے بعد تمہارے سارے گھر والوں کو بچالوں گا، بس ایک تم میرے پاس آجاؤ ـــــ آجاؤ شانتی"۔

شانتی چپ چاپ ٹکٹکی باندھے اُسے گھورتی جارہی تھی۔ اور جب جعفر نے باہیں اوپر اُٹھا کر ہاتھ پھیلا دئے اور دیر تک پھیلائے رکھے۔ جب بھی وہ اُسے صرف گھورتی رہی، اور پھر پرلی گلی میں شور بلند ہوا۔ فسادیوں کا انبوہ ناچتا چیختا بڑھا آرہا تھا، اور شانتی کے گھر کا دروازہ جس پر کنستروں کے ٹکڑے منڈھے ہوئے تھے ٹوٹ کر گرنے ہی والا تھا، ـــــ "میری کرپان!" شانتی نے پہلی بار اندازِ نشست کو بدلا۔ اور کرپان نکال لی!

جعفر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "نہیں" وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔ "ایسا نہیں ہوگا۔ تم ایسا نہیں کرو گی ——— تم میرا انتظار کرو گی۔ تمہیں اپنا واسطہ، تمہیں اپنے واہگرو کا واسطہ!" وہ گلی کے سرے پر نمودار ہوتے ہوئے انبوہ کی طرف لپکا، اُن کے آگے آگے دھمادھم ڈھول بج رہے تھے، اور ہر طرف کلہاڑیاں، نیزے، برچھے اور چھرے چمک رہے تھے، اور وہ شانتی کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

جعفر بے تحاشا بھاگتا ہوا آیا اور دونوں ڈھولوں کو اپنے چھروں سے پھاڑ ڈالا۔ شور اچانک تھم گیا۔ جعفر پھر بھاگا اور شانتی کے گھر کے ٹوٹتے ہوئے دروازے پر جا پہنچا، اور پھر اچک کر دیوار پر بیٹھتے ہوئے وہ چلانے لگا "میرے بھائیو! مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ وہ مسافر اصل میں انگریز نے بھیجا تھا، اس کا پیشہ ہی یہی ہے کہ وہ گاؤں گاؤں جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں زہر بھر دیتا ہے۔ یہ انگریز کی چال ہے اور اب ہم اس کی چال میں نہیں آئیں گے۔ اگر یہ اس کی چال نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ذیلدار اور نمبردار اور کرسی نشین اور سفید پوش سب کے سب اپنی چوپالوں پر بیٹھے حقے گڑگڑا رہے ہیں اور پنڈلیاں دبوا رہے ہیں اور ہم غریب سکھوں اور کمزور ہندوؤں کے سینوں میں چھرے گھونپ کر اسلام کا نام اونچا کر رہے ہیں، کیا اسلام نے ہمیں یہی سکھایا ہے؟ لاہور کا بدلہ اگر یہاں لیا گیا ہے تو کیا یہاں کا بدلہ دلی میں نہیں لے لیا جائے گا۔ اور پھر میرے بھائیو، یہاں وہ کون سا سکھ یا ہندو تھا جو ہماری شادیوں اور ہماری غمیوں میں شریک نہیں ہوتا؟ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ یہاں مسلمان کے جنازے کے ساتھ ایک طرف اُداس

سکھوں کی ٹولی بھی ہوتی ہے؟ اور میّت کو دفنانے کے بعد سکھ آتے ہیں اور نہایت ہمدردی سے کہتے ہیں "مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے فاتحہ پڑھ دیجئے!" اور کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہماری عیدوں پر یہاں کی دھرم شالہ میں پرشاد بانٹا گیا ہے، اور کیا تم نہیں جانتے کہ اس گاؤں کے دونوں کنوئیں سکھوں نے کھدوائے ہیں کیا تم نے بوڑھے پنساری ایشر سنگھ کو نہیں دیکھا کہ وہ غریب مسلمانوں کو مفت دوائیں دیتا ہے، اور ہرنام سنگھ اپنے خرچ پر گاؤں کی گلیاں صاف کراتا ہے، اور کپتان کھڑک سنگھ نے اس گاؤں کے دو تین سو نوجوانوں کو نوکریاں دلوائی ہیں اور اتنے ہی گھروں کو فاقوں سے بچایا ہے؟"

مجمع پر سکوت طاری تھا، چند ایک لوگوں کے تو سر بھی جھک گئے تھے، اور دکانوں کو لوٹتے ہوئے بچے ریوڑیاں چبانا تک بھول گئے تھے۔

اچانک جعفر دیوار پر سے کودا اور ایک طرف بھاگتے ہوئے چلایا "گلی گلی میں بکھر جاؤ! اور سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے سینوں سے لگالو انہیں دلاسے دو، اُن سے پیار کرو اور اس گاؤں کو، اس پنجاب کو، اس دنیا کو اُجڑنے سے بچالو، آگ بجھاؤ، زخمیوں کے پٹیاں باندھو۔ اور اعلان کردو کہ ہم اس گاؤں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ مٹا کے دم لیں گے۔ گلی گلی میں بکھر جاؤ ——— جاؤ"

اور پھر کچھ دیر کے بعد گاؤں سے سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں آرہی تھی، چند سفید ریش سکھ مسجد کی محراب کے پاس کھڑے مسلمان بزرگوں سے باتیں کر رہے تھے اور جعفر جیسے کرسی نشین ایسے پکے مسلمان نے ماں کی گالیاں دی تھیں اور اس سے ہل چھین لینے کی دھمکی دی تھی، دھرم شالہ

کے چبوترے پر ننھے ننھے سکھ بچوں کو بہلا رہا تھا ــــ

چند دنوں میں سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی دکانیں بھی کھول لیں اور سنگھ ہٹ بھی آباد ہو گیا، اور کانسی کے چاندوں میں چاندنیاں بھی انڈیلی جانے لگیں اور بڑی گلی کے موڑ پر بیٹھے ہوئے جعفر کی مرگی کے قصے پھر سے تازہ ہو گئے، شانتی ایک ہاتھ سے گاگر تھامے اور دوسرے ہاتھ سے دوپٹے کو سنوارتی کہیں دور دیکھتی ہوئی آئی اور جعفر اٹھنے کی کوشش میں بیٹھا ہی رہ گیا۔ اور سلیٹی بندیا نے شفق میں گھلی ہوئی کرنوں سے شانتی کے چہرے پر گلال چھڑک دیا۔

اور پھر ایک روز جب جعفر کسی دُور کے گاؤں میں کبڈی کا مقابلہ دیکھنے کے بعد شام سے کچھ دیر پہلے اپنے گاؤں کو پلٹا۔ اور پہاڑی درے سے گزر کر میدان میں آیا تو اُسے سامنے کچھ دور اپنا گاؤں نظر آیا۔ جس میں آج شاید اکٹھے بیس پچیس تنور بھڑک اُٹھے تھے، اور گلیوں میں لوگ بھاگتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور عورتیں چھتوں پر بیٹھی تھیں اور کتّے بے تحاشا بھونک رہے تھے،

ایک لمحے کے لئے تو وہ جم کر رہ گیا۔ اور پھر ایک دم اس تیزی سے بھاگا کہ کنکر، اس کی چپلیوں کے نیچے چیخ چیخ اُٹھے، اور جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں پہنچا۔ تو اُسے سکھوں کی ایک قطار نظر آئی، جن کے آگے بوڑھا پنساری ایشر سنگھ تھا۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا آ رہا تھا۔ اور قدم قدم پر تھم کر اپنی آنکھیں پونچھتا تھا، پلٹ کر دیکھتا تھا۔ اور پھر رینگنے لگتا تھا۔ جعفر کو دیکھتے ہی وہ بچوں کی طرح بلبلا اُٹھا، "جعفر، میرے بیٹے ہم کو لوٹ لیا گیا۔ ہمیں یہاں سے نکالا جا رہا ہے اور ہماری بیٹیوں کو آپس میں بانٹا جا رہا ہے؟"

اور پھر سکھوں کی اس لمبی قطار نے جعفر جعفر کی رٹ لگا دی، اور جعفر الیشر سنگھ کے پاس تھم کر پھر اُسی طرح بھاگنے لگا، اور جب وہ قطار کے آخری سرے پر پہنچا تو کرسی نشین ہاتھ میں برچھا تھامے اس شان سے آ رہا تھا جیسے ایک ذمے دار چرواہا ریوڑ ہانکے چراگاہوں کو جا رہا ہے۔ جعفر کو دیکھتے ہی وہ گرجا "آج تیرے انگریز کا بھیجا ہوا ایک اور مسافر آیا تھا۔ جس نے ہمیں بتایا کہ ——"

"وہ بکواس کرتا ہے"۔ جعفر چیخا۔ "اور اگر وہ سچ بھی کہتا ہے تو بھی ہم ایسا نہیں کریں گے، ہم مسلمان ہیں"۔

"تو پھر بکواس کرنے لگا" کرسی نشین پھر گرجا۔ اور گاؤں والوں نے اُس کی ہم نوائی کی۔

"یہ کیا کم ہے" کرسی نشین بولا، "کہ ہم ان سب کو زندہ سلامت قصبے میں پہنچا دیں گے"—— اور وہ آگے بڑھ گیا۔

اور جعفر ایک کھنڈر کے پرنالے کے نیچے کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ لیکن یہ ایک عجیب بات تھی کہ ان میں ایک نوجوان بھی تو نہ تھا، یہ سب کے سب ادھیڑ عمر والے یا بوڑھے اور بہت سے بچے تھے، جو اپنے صدیوں کے مہمانوں کو رخصت کرنے جا رہے تھے!

جعفر پھر گاؤں کی طرف بھاگنے لگا اور جب وہ مسجد کے سامنے والے چوراہے پر پہنچا تو اُسے گاؤں کے نوجوان نظر آئے جو عورتوں کی ایک قطار کے اردگرد کھڑے تھے، اور ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں شفق نے گھل کر ہر طرف گلال چھڑک دئیے تھے اور پرندے واپس اپنے آشیانوں کو جا رہے تھے۔ اور مسجد کے صحن میں اُگی

ہوئی بیری کی آخری پھننگ پر ایک بھٹکا ہوا کوا رو رہا تھا، اور مشرق سے کانسی کی ایک گاگر اُبھر رہی تھی۔

"شانتی"! جعفر کی دو برس کی جھجک غبارے کی طرح پھٹ گئی، اور بکھرے ہوئے بالوں، پھٹے ہوئے کپڑوں اور کہیں دور جمی ہوئی آنکھوں والی شانتی نے پلکیں تک نہ جھپکیں۔

"شانتی"، جعفر نے اُسے چھو لیا۔ اس کا ہاتھ جھنجھوڑا، اور پھر پلٹ کر نوجوانوں کی طرف دیکھا جو ایک دم اس زور سے ہنسے کہ شانتی تک لرز گئی۔

ایک نوجوان ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لئے آیا اور جعفر کے ہاتھ کو نہایت نرمی سے شانتی کے کندھے پر سے اُٹھاتے ہوئے کہا "آپ ذرا ادھر دیوار سے لگ کر بیٹھ جائیے، یہ موتی ہم نے پایا ہے اور ہمارے ہی حصّے میں آیا ہے، سارا گاؤں گواہ ہے۔"

جعفر کے سارے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے اُس نے چھرا نکالا اور پاگلوں کی طرح چیخوں میں بولنے لگا "کوئی چھو کر تو دیکھے شانتی کو ــــ شانتی میری ہے ــــ یہ برسوں سے میری ہے، ــــ شانتی کو کوئی نہیں لے سکتا، کسی ماں کے لال میں حوصلہ ہو تو میرے سامنے آئے"!

پچاس ساٹھ نوجوانوں کے چھرے ایک ساتھ شفق میں شعلوں کی زبانیں بن کر چمکے اور جعفر کی آنکھوں کے سامنے ان گنت الاؤ ناچنے لگے۔ "فیصلہ ہو چکا ہے۔" ایک نے جعفر کو ڈپٹ کر کہا "شانتی شیرے کو مل چکی ہے۔"

"شانتی کو کوئی نہیں لے سکتا" ایک بار پھر اُس کا جسم لرزا۔

نوجوان پھر ایک ساتھ ہنسے "ہٹ جاؤ اُدھر" شیرے نے اُسے دھکا دیا،

اور شانتی کی طرف بڑھا اور شانتی باہیں پھیلا کر جعفر کی طرف بڑھی اور جعفر ایک مسحور انسان کی طرح شانتی کی طرف بڑھا۔ مگر شیرا بھر بیچ میں حائل ہو گیا اور شانتی کو بازو سے کھینچ کر پرے لے جانے لگا۔

"شانتی تمہاری نہیں" جعفر چلایا۔

"تمہاری بھی نہیں"۔ شیرا چلایا۔ "مرگی تو نہیں ہو رہی تمہیں"!

"شانتی کسی کی بھی نہیں"۔ جعفر نے نہایت سکون سے کہا "شانتی نہ تیری ہے نہ میری ہے، یہ کسی کی بھی نہیں۔ شانتی کو کوئی نہیں لے سکتا، نہ تم، نہ میں، نہ کوئی اور"۔

اور پھر مرتی ہوئی شفق میں جعفر کا چھرا ایک بجھتے ہوئے شعلے کی طرح لپکا اور شانتی کے پیٹ میں کروٹیں بدلتا ہوا، دوسری طرف سے نکل کر اپنی نوک کو زمین میں ڈبو کر رہ گیا۔

آسمان پر کانسی کی گاگر کو ایک بدلی نے کاٹ دیا تھا:

تسکین

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب نئے نویلے پاکستان میں ہر روز لاکھوں پناہ گزین داخل ہو رہے تھے اور حکومت کا ہاتھ بٹانے کیلئے "معزّزین شہر" نے بھی قدم اُٹھایا تھا۔ میدان میں میلوں تک اِنسانی بلبے کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ اُبھرتے ہوئے سُورج نے اِن ڈھیروں کے سایوں کو دُور تک پھیلا رکھا تھا۔ ایک شامیانے کے نیچے بیٹھے ہوئے ایثار پیشہ بڑے لوگ تعداد کا اندازہ لگا رہے تھے۔

"کوئی پون لاکھ ہوں گے۔" ایک صاحب نے پپوٹے سمیٹ کر آنکھوں کو دوربین بنا لیا۔

"پون لاکھ؟" دوسرے صاحب نے پلٹ کر کہا۔ "ہجوم کی تعداد کا انداز لگانا بہت مشکل ہوتا ہے حضور! ڈیڑھ لاکھ کہئے۔"

"چلئے ڈیڑھ لاکھ سہی۔" پہلے صاحب بولے، اور مسئلہ حل ہو گیا۔

"کتنی زبردست ٹریجیڈی ہے" ! راؤ صاحب ایک لمبی سانس لے کر خلا میں گھورنے لگے، ـــ

"ـــ کتنی بڑی کیٹسٹرفی ہے۔ کہ انسان ایک بار پھر جنت سے نکال دیا گیا۔"

چودھری صاحب جو راؤ صاحب کے "ماتحتانِ اعلیٰ" کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔ یوں تڑپے جیسے کسی شعر کی داد دینے چلے ہیں "سبحان اللہ۔ کیا بات پیدا کی ہے آپ نے۔" انہوں نے بے بازو کی ایک کرسی کے بازو تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "وطن ہی تو جنت ہے اِس دُنیا میں۔"

راؤ صاحب بجھے ہوئے سگار کو کرسی کے بازو پر رکھ کر بولے۔ "اِس کھیل میں اب کے بھی ایک شیطان ہی کا ہاتھ رہا اگرچہ شیطان نیا ہے۔"

چودھری صاحب نے داد دینے کے انداز میں پہلو بدلا "واہ۔ استعارہ کیا ہموار جا رہا ہے۔ مگر ـــ گستاخی معاف ـــ" اور وہ اُٹھ کر سامنے بازوؤں والی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ "مگر شیطان تو وہی پُرانا ہے حضور۔ صرف انسان بدلا ہے۔ برٹنڈرسل نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ انسان نے ـــ"

اور میدان میں پتھروں، گودڑوں کے گٹھوں کے آس پاس بدلے ہوئے انسان نتھنوں اور آنکھوں میں گھستی ہوئی مکھیاں اُڑا رہے تھے، اوپر چیلیں اُڑ رہی تھیں۔ اور نیچے چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ جیسے وہ انسانوں کے اِن کھنڈروں کی سیاحی میں سرگرداں ہیں۔ جن کے آس پاس ننھے بچے زمین پر لوٹ لوٹ کر اور گلابی ہاتھوں سے مٹی نوچ نوچ کر مم مم پکار رہے تھے۔ مائیں تنکوں اور

جھانکڑوں کی آنچ پر دال اُبال رہی تھیں۔ بوڑھی عورتوں کی آنکھیں کھردری چادروں کی مسلسل چارہ سازی سے چھل رہی تھیں، نوجوانوں کے چہروں پر جیسے شباب کا الاؤ بھڑک کر بجھ گیا تھا، اور بوڑھوں کی جھریوں میں زندگی نے بھٹک بھٹک کر دم توڑ دیا تھا۔

راؤ صاحب جنہوں نے بجھا ہوا سگار جلا لیا تھا کہہ رہے تھے "برٹنڈ رسل اچھا فلسفی ہے۔ مگر اُس کی "انڈیوجوالیٹی" اُبھر نہیں سکی، ارسطو سے لیکر رادھا کرشنن تک فلسفے کی جتنی تھیوریز پیش کی گئی ہیں وہ سب اس کے یہاں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ جیسے کوئی پھول کو گل اور پتھر کو سنگ کہہ دے!"

چودھری صاحب کے تلوے میں جیسے فتیلہ جل اُٹھا۔ تڑپ کر بولے "حضور کا مطالعہ بے پناہ ہے۔ ویسے میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسل نے عوام کی ذہنیت کا خاصا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور ان کی بھیڑ چال کی عادت کو جس منطقی تسلسل سے نمایاں کیا ہے۔ وہ آج۔ اس وقت ان نو وارد پناہ گزینوں کو دیکھ کر تو حرف بحرف سچ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ بھی کوئی طریقہ ہے راؤ صاحب، کہ امرتسر پر مصیبت ٹوٹی اور حصار گوڑگانوں تک کے مسلمان عورتیں چھوڑے سنتے سنبھالے بھاگ نکلے۔ یعنی یہ بھی کوئی بات ہوئی! اور یہ سامنے پڑے ہیں۔ پاکستان کے لئے ایک خوفناک سوالیہ نشان بن کر"

اور میں سوچنے لگا کہ راؤ صاحب اور چودھری صاحب بھی تو پناہ گزین ہیں بیچارے یہ بھی تو فلسفے کے پاکستان میں کسی ذہنی کیمپ کی تلاش میں ہیں۔ انہیں عوام کے خاموش احتجاج نے اس جہنم میں کیسے دھکیل دیا۔ جہاں نہ کوئی رسل

ہے نہ کرشنن! بلکہ ہر طرف کسان ہیں جن کے پاس ہل نہیں۔ مزدور ہیں جن کے پاس کدالیں نہیں۔ یتیم ہیں۔ اور بیوائیں اور زخمی اور بیمار، اور میدان ایسا ہے جس میں قدم رکھتے ہی ارسطو سے لے کر رسل تک سب فلسفی دم توڑ دیں۔ کیونکہ یہاں سبب اور نتیجے کے ہیر پھیر اور اقلیدس کے خطوط کے تذکرے نہیں۔ یہاں تو ٹوٹے پھٹے انسان بچے کھچے جسموں پر سے دھول جھاڑتے ہیں۔ تو جسم کی کترنیں گرنے لگتی ہیں۔ اور ہونٹوں کی پپڑیوں کے کنارے خون آلود ہو رہے ہیں۔ اور آنکھوں میں جیسے آندھیاں گھس گئی ہیں۔

ہم سب پر تکلف کوٹھیوں کو تج کر محض جذبۂ خدمت سے مجبور ہو کر یہاں آئے تھے کہ کیمپ کے مختلف فرائض ہمارے سپرد کئے جائیں۔ اور ہم اپنے نئے نویلے وطن کو کچھ سہارا دے سکیں۔ اور یہاں ٹائی کے رنگوں اور کالر کے ڈیزائن سے لیکر علم الکلام اور حیات بعد الممات تک پر بحثیں جاری تھیں۔ اور میدان پر چھائے ہوئے سناٹے میں جیسے کوئی پکار رہا تھا "ہم دلاسوں کے بھکاری اور تسلیوں کے گداگر ہیں۔ ہمارے آنسو پونچھو، ہمیں تھپکو، ہمیں بہلاوء! ہم سے باتیں کرو!"

"بھیا!" میں نے پرلی طرف سے گذرتے ہوئے ایک پناہ گیر کو بلایا۔

وہ ٹھٹک کر مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اور پھر وہیں سے بولا

"میں نے تو اپنا نام لکھوا دیا ہے۔ جی"!

"بات سنو!" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ گھبرایا ہوا میرے قریب آگیا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی میں نے یہ سب کچھ لکھوا دیا ہے"۔ وہ کچھ ایسے انداز سے بولا جیسے میں اُس کا وقت ضائع کرنے کا مرتکب ہو رہا ہوں"!

"تم تیز تیز جا رہے تھے اس لئے میں نے کہا شائد میرے لائق کوئی خدمت ہو"۔ میں دراصل اپنے ذہن کے لئے ایک صدمہ تیار کر رہا تھا۔

اُس کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ مگر کچھ عجیب بھدا سا، جیسے مرجھائے ہوئے گلاب کو گلابی رنگ میں ڈبو دیا جائے۔ بولا "میرا ننھا بیمار ہے جی۔ کوئی ڈاکٹر مل جاتا تو دوا لے لیتا۔ گاڑی میں پیاسا رہا۔ یہاں شائد بہت پانی پی لیا ہے اُس نے"۔

"کیوں صاحب!" میں نے "کرسی نشینوں" کو مخاطب کیا۔ "آپ لوگوں میں ڈاکٹر ہوگا کوئی؟"

سب نے پلٹ پلٹ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مجھے ٹکر ٹکر گھورنے لگے۔

"اس کا بچہ بیمار ہے"۔ میں نے راؤ صاحب کے تن و توش سے اُن کی ذمہ دارانہ حیثیت کا اندازہ لگا کر کہا۔

"کتنے ہی بچے بیمار ہوں گے"۔ وہ سگار کو لبوں کے گوشے میں ٹھونس کر بولے۔ "آپ ایک ہی بچے کا ذکر سُن کر کانپ گئے۔ یہاں تو مضبوط دل گردے سے کام چلے گا صاحب"۔

چودھری صاحب کرسی کے ایک بازو پر کہنی ٹیک کر مسکرانے لگے۔ "یہاں تو ایک انار سو بیمار کیا ہزار، لاکھ بیمار والا قصہ ہے صاحب۔ آپ کیوں اُن کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ ڈیوٹیاں تقسیم ہونے دیجئے۔ بیمار بچوں کی نگرانی

آپ کے سپرد ہوئی تو ہمیں قطعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیوں بھئی ہوگا کسی کو اعتراض!"

راؤ صاحب کا پیٹ اُچھلا، اور کھلے دہانے سے ایک قہقہہ آم کی گٹھلی کی طرح ٹپک پڑا۔ انہوں نے چودھری صاحب کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ اور میں نے چپ چاپ کھڑے ہوئے پناہ گیر سے کہا "بے فکر رہو بھائی۔ ابھی بھجواتے ہیں کوئی ڈاکٹر۔ کہاں ہو تم؟"

مضمحل سے لہجے میں بولا "وہاں۔ دور، مغربی گوشے میں۔"

وہ چل دیا۔ اور میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے میں نے ایک بچے کو قتل کر دیا ہے، اچانک شامیانے میں ایک بزرگ داخل ہوئے۔ نہائت جابر قسم کے انسان معلوم ہو رہے تھے۔ بھوؤں کے درمیان ایک شکن یوں چمٹی ہوئی تھی۔ جیسے چھرے کی نوک سے نہایت اہتمام سے تراشی گئی ہے۔ وہ سب لوگوں کو مختلف فرائض سپرد کرتے چلے آئے۔ اور جب چودھری صاحب کے قریب پہنچے تو بولے "آپ، بیمار بچوں کی فہرست بنائیے۔"

اور جیسے چودھری صاحب کی کرسی کے بازو اچانک غائب ہو گئے، انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر بزرگ نے راؤ صاحب سے بات شروع کر رکھی تھی "آپ حاملہ عورتوں کی فہرست بنائیے۔"

"مگر مولانا۔ مجھے بتائیے گا کون"۔ وہ سگار کو زمین پر پھینک کر بولے۔ "یہ ڈیوٹی کسی خاتون کے سپرد ہونی چاہیئے۔"

"آپ مجھے بے مزہ انسان معلوم ہوتے ہیں"۔ بزرگ آگے بڑھ آئے، اور

وہ دونوں ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگے، جیسے وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے۔ اور اگر دیکھ رہے ہیں تو دیکھنا نہیں چاہتے، بس مجبور ہیں،۔

بزرگ میرے پاس آچکے تھے:" آپ —— آپ یوں کیجئے کہ پناہ گزینوں سے ان کے عزیزوں کے بارے میں پوچھئے کہ وہ کہاں تھے۔ کہاں رہ گئے۔ اور اُن کو کس رستے سے مدد پہنچائی جاسکتی ہے"۔

اور میں فرائض کی تقسیم کا تماشا دیکھنے کے بجائے کیمپ کے منتظمین سے کاغذوں کا ایک پلندہ لے کر انسانی کھنڈروں میں گھس گیا۔ فخر کے جذبات نے میری رفتار ضرورت سے زیادہ تیز کردی تھی۔ ایک ایسا فرض میرے سپرد ہوا تھا۔ جس سے ہزاروں انسان بے آبروئی اور موت کے چنگل سے نجات پاسکتے تھے۔ میں بڑھتا چلا گیا کہ کہیں ایک سرے پر بیٹھ کر فرداً فرداً سب کو بلاؤں گا۔

ایک جگہ پر رک کر میں نے ایک پناہ گیر کو اپنی طرف بلایا۔ وہ ایک گٹھڑی کا سہارا لئے اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے سہلا رہا تھا۔ میں نے اُس کے عزیزوں کے بارے میں پوچھا تو اچانک وہ بچے کی طرح رونے لگا۔" وہ سب مرچکے ہیں میاں جی"۔ وہ ضبط کرنے کی کوشش میں جسم کا سارا لہو اپنے چہرے پر لے آیا۔" یہ کرتے پر نشان دیکھ رہے ہیں، آپ؟ یہ اور یہ، یہ مجھے میرے بیٹے کی انتڑیوں کا ہار پہنایا گیا تھا"۔ اور وہ اوپر کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر جھک گیا اور پھر بیٹھ گیا۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔" ارے بھئی کسی کا کوئی عزیز پیچھے رہ گیا ہو۔ تو مجھے بتاؤ تاکہ انہیں مدد پہنچائی جاسکے"۔ اور اچانک چلاتے بلبلاتے لوگوں کے ایک جم غفیر نے مجھے اپنی واویلا میں جکڑ لیا —" میری ماں — میرا بچہ — میری بیٹی —

میری بہن ـــــ میرا باپ ـــــ" ایک مسلسل بھنبھناہٹ تھی جو ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ اور میں پنسل تولے، فرش پر حیران بیٹھا تھا۔

"میری ماں"۔ ہجوم میں سے کوئی لڑکا بچھڑی ہوئی کونج کی طرح پکارا "وہ مکی کے کھیت میں تھی"۔

رضاکاروں نے نہایت مشکل سے پناہ گزینوں کو ایک ایک کر کے میرے پاس آنے پر رضامند کیا۔ اور اب میری پنسل صفحوں پر صفحے سیاہ کرنے لگی۔

"میری بہن۔ فسادیوں نے خنجروں سے کپڑے پھاڑ دیئے تو مارے حیا کے اُس نے دیوار سے سر پھوڑ لیا۔ اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ مری نہیں تھی میاں جی! وہ بے ہوشی میں بھی اپنا جسم ڈھانکنے کے لئے یوں ہاتھ ہلاتی تھی۔ جیسے چادر اوڑھ رہی ہے۔ وہ زندہ تھی۔ میری بہن زندہ تھی"۔

"میرا بھائی۔ حملہ ہوا تو اُس نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ اور سگنل والوں کی کوٹھڑی میں سر کے بل جا گرا۔ اِس کے بعد گاڑی آگے نکل آئی۔ مگر وہ وہیں دبک گیا ہو گا۔ اُس کوٹھڑی میں کوئی جائے تو وہ مل جائے گا۔ وہ ضرور مل جائے گا۔ میرا دل کہتا ہے، میرا ایمان کہتا ہے"۔

"جب ہم ماں بیٹا بھاگے آ رہے تھے تو اُدھر سے فسادیوں نے ہماری ایک ٹولی پر ہلّہ بول دیا۔ اور ہم مکی کے کھیت میں بھاگ آئے۔ جب ہم کھیت میں گھُسے ہیں تو ایک دُوسرے کو کھو بیٹھے۔ فسادیوں کے ڈر کے مارے میں چلا تک نہیں سکتا تھا بابو جی! شام کو میں رینگ کر مینڈ پر آیا تو فوج والے مجھے لاری میں بٹھا کر یہاں لے آئے۔ ان کے پیچھے فسادی تھے۔ ورنہ وہ میری ماں کو ضرور ڈھونڈتے۔ اور بابو جی۔

مجھے خدا کی قسم، میری ماں مکّی کے کھیت ہی میں تھی، کوئی نہ مانے تو جا کر دیکھ لے۔ قرآن شریف لائیے، میں اُسے سر پر رکھ کر کہہ دوں گا۔ کہ وہ مکّی کے کھیت میں ہے۔ میری ماں مکّی کے کھیت میں ہے!"

"وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ مر جانا چاہتی تھی، اور وہ اُسے بالوں اور باہوں سے پکڑے گھسیٹے لئے جا رہے تھے۔ نہر کی طرف، اور پھر گاڑی چلی آئی تھی۔ وہ نہر کے آس پاس کے کسی گاؤں میں ہو گی۔ نہ ہوئی تو میری ناک کاٹ لیجئے گا۔"

"میرا بچہ — وہ دودھ پی رہا تھا کہ فسادیوں نے اُسے میری گود سے نوچ کر مکان کی چھت پر، — یوں — گیند کی طرح اُچھال دیا۔ لیکن وہ مرا نہیں ہو گا میاں جی۔ بچوں پر تو خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ زندہ ہو گا۔ وہیں چھت پر پڑا انگوٹھا چوس رہا ہو گا۔ میرا بچہ۔ میرا ننھا۔ میرا لال —"

اور جب سورج مغربی اُفق سے چمٹی ہوئی دُھند میں رینگ گیا۔ تو میں اُٹھا۔ "پہلے یہ کاغذات پہنچا آؤں"۔ میں نے ہجوم سے کہا۔ اور پنسل کو بائیں ہاتھ میں لینا چاہا! مگر پنسل جیسے میری اُنگلیوں کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ اُس کو کھینچنے سے ایک ٹیس سی اُٹھی اور میں پلندے کو سینے سے لگائے شامیانے کی طرف لپکا۔ غیر مرئی چادریں اوڑھتی ہوئی بہنیں، سگنل کی کوٹھڑیوں میں دبکے ہوئے بھائی، مکّی کے کھیتوں میں بھٹکی ہوئی مائیں۔ پتھروں اور کانٹوں میں گھسیٹی جانے والی بیویاں، اور ویران چھتوں پر انگوٹھے چوستے ہوئے بچے قطار اندر قطار میرے سامنے ناچنے اُچھلنے لگے۔ اور میں بڑھتا چلا گیا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اور ہر لمحے کے ساتھ سینکڑوں معصوم زندگیاں چھٹی جا رہی تھیں۔ سینے کوٹتی ہوئی مائیں اور بال نوچتی ہوئی بہنیں

مجھے اپنی طرف بلا رہی تھیں - اور میں بھاگتا جا رہا تھا - اور جب کیمپ پر جھٹپٹے کا پھیکا پن چھا گیا - تو میں بزرگ کے خیمے میں فتح مندانہ انداز میں داخل ہوا —

"یہ ہیں اُن کے عزیزوں کے —"

"ذرا ٹھہریئے!" بزرگ کی شکن گہری ہو گئی -

"نہیں نہیں" میں پاگلوں کی طرح چلّایا "پہلے میری بات سنیئے، آپ کو پہلے میری بات سننا ہو گی" میری آنکھوں میں جلتے ہوئے آنسو تیر رہے تھے۔

"تھوڑی دیر ٹھہریئے!" بزرگ نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور پھر راؤ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے -

"یہاں کوئی عورت حاملہ نہیں" راؤ صاحب بولے،

"یہاں کوئی بچہ بیمار نہیں" چودھری صاحب نے اپنی کارگزاری کی روداد پیش کی،

اور میں چلّایا "اور وہاں ہزاروں بچے سلگتی ہوئی چھتوں پر پڑے بھن رہے ہیں - اور سینکڑوں عورتوں کی کوکھ میں خنجر ڈبوئے جا رہے ہیں - اور مکّی کے کھیتوں میں دم توڑتی ہوئی بوڑھیاں کراہ رہی ہیں - اور بہنیں جن کے بھائی مر چکے ہیں - اور بیویاں جن کے شوہر بھاگ آئے ہیں - وہاں ہماری عصمت کو بالوں اور بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹا جا رہا ہے - وہاں ہماری آبرو ننگ دھڑنگ پڑی تڑپ رہی ہے اور یہ ہے اُن کی روداد، مولانا - ابھی ایک بہت بڑے کانوائے کا انتظام کیجیے۔ فوج بھیجیئے - پولیس بھیجیئے - رضاکار بھیجیئے، ابھی اسی وقت، ورنہ ہمارے لاکھوں بھائی لُٹ جائیں گے - اور ہمارا قومی اثاثہ برباد ہو جائے گا - مولانا - مولانا —" اور

میں نے کاغذوں کا پلندہ بزرگ کے ہاتھوں میں ٹھونس دیا۔ اور رومال سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

اور چودھری صاحب بولے "برٹنڈرسل نے انسان کی جذباتیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ ——"

میں نے گرج کر کہا۔ "مولانا۔ فلسفے کے بجائے اس وقت ہمیں کانوائے کی ضرورت ہے فوراً انتظام فرمائیے —— آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"میں سوچ رہا ہوں" بزرگ کے ہونٹوں کے ایک گوشے میں ایک ہولناک سی مسکراہٹ پانی کے بلبلے کی طرح اُبھر کر مٹ گئی "میں سوچ رہا ہوں کہ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے، یہ پلندہ اپنے پاس رکھئے"!

"مگر آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ——" میری آواز میں فریاد تھی اور احتجاج تھا!۔

"جی ہاں" مولانا نہایت اطمینان سے بول رہے تھے۔

"یوں نہ کیا جاتا تو یہ آپ کو ہر روز تنگ کرتے رہتے۔ یہ سب کچھ بیچاروں کی تسلی ہی کے لئے ہو رہا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں ان حالات میں کون جا سکتا ہے وہاں۔ —— خیر اب آپ کل بقیہ لوگوں کے عزیزوں کے بارے میں پوچھئے گا۔ تسلی ہوتی رہے گی بے چاروں کی۔"

جب بادل اُمڈے

جب اُس نے سامنے پہاڑی پر بکھرے ہوئے گاؤں کو دیکھا، تو اس کے خاکستری گھروندے اسے اجنبی سے بھی معلوم ہوئے اور مانوس سے بھی۔ وہ مغربی پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی میں پیوست سنہری سورج کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا، دہقان کاندھوں پہ ہل رکھے پگڈنڈیوں پر سے ہوتے ہوئے بڑے راستے کیطرف آ رہے تھے، اور گاؤں کے تنوروں میں سے دھوئیں کے بہت سے مینار بلند ہو رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار اُسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ کاش ان میناروں میں سیڑھیاں ہوتیں، اور وہ لپک کر ایک مینار کی چوٹی پر جا نکلتا، اور دھوئیں کے پردے سرکا کر شریر بچوں کی سی سیٹیاں بجاتا، تالیاں پیٹتا اور چلّاتا "میں وہی ہوں دوستو جس کے پہلو میں کرپان بھونک کر تم دلدل میں پھینک آئے تھے۔ وہی آج اس دودھیا مینار کی بلندی پر سے تمہیں پکار رہا ہے، اور پوچھ رہا ہے کہ مزاج

تو اچھے ہیں آپ کے!"

مسکرا کر اس نے بھاری بھرکم بستر کو کاندھے پر سے اُٹھا کر سینے پر رکھ لیا، اور کپڑوں میں لپٹے ہوئے برتن کھڑ کھڑا اُٹھے، سورج پہاڑوں میں ڈھلک گیا۔ اور چڑیوں کا ایک غول فضا میں سے اتر کر اس کے سر پر ایک سنسناتی ہوئی قوس بناتا اوپر اُبھر گیا۔ اور پھر اُدھر سے ایک دہقان پکارا "کہاں سے آئے ہو بھئی؟"

"ہندوستان سے" اُس نے بستر کو پھر سے کاندھے پر رکھ لیا۔

"پاجامے اور صورت سے مہاجرین لگتے ہو" دہقان دونوں بیلوں کی رسیں ایک ہاتھ میں تھام کر بولا۔

"مہاجر ہی ہوں" اُس نے فخر سے کہا، جیسے اس کے سر پر ریشم کی پگڑی اور مرصع کلغی ہے۔ اور جیسے دہقان لپک کر اس کے قدموں سے لپٹ جائے گا۔ اور کہے گا "میرے بزرگ، میرے بھائی، میرے دوست، تمہیں دشمنوں نے پیٹا ہے؟ کہاں کہاں زخم ہیں تمہارے؟ لاؤ میں ان پر اپنے ہونٹ رکھ دوں، اور ان میں بسا ہوا سارا درد چوس لوں۔ مجھے تمہارا انتظار تھا، کتنے برسوں سے مجھے تمہارا انتظار تھا"— اور دہقان سچ مچ آگے بڑھا اور بولا۔ "لاؤ بھیا، یہ بستر میں اُٹھا لوں؟"

"اور بیل؟" اس نے سرشار ہو کر پوچھا،

"یہ اپنے گھر کا رستہ جانتے ہیں" وہ بستر کو چھین کر اپنے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ یہیں کے رہنے والے ہیں، یہ ہندوستان سے نہیں آئے" دونوں زور سے ہنسے، اور پھر دہقان بولا "یہاں زمین ملی ہے یا دکان یا صرف مکان؟"

"زمین۔"

"وہاں کیا کچھ چھوڑ آئے ہو؟"

"زمین اور مکان اور ایک جوان بیٹی اور دو معصوم بچے اور ـــــ" اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"اور بیوی؟"

"نہیں، بیوی تو سال بھر پہلے چل بسی تھی۔"

"تو پھر اور کیا؟"

"اور ـــــ اور ـــــ" وہ جھینپ کر مسکرانے لگا۔

دہقان رک کر اسے کچھ دیر تک گھورتا رہا، اور پھر زور سے قہقہہ لگا کر بولا۔ "معاف کرنا بھئی، جھٹپٹے میں تمہارا چہرہ صاف نظر نہیں آیا، اس لئے تمہیں بڈھا سمجھ بیٹھا ـــــ اچھا تو تم یہ سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچے ہو!"

اس کے لبوں پر سے مسکراہٹ بھاپ کی طرح اڑ گئی۔ "سب کچھ لٹا کر۔" اس نے اپنے بستر کی طرف دیکھا۔

"سودا مہنگا پڑا؟" دہقان نے پوچھا۔

اور وہ فخر سے تن گیا۔ "نہیں نہیں، ان سب کے بدلے میں مجھے ایک وطن ملا، اور یہ زمین ملی۔ یہ گاؤں اور یہ پہاڑیاں اور یہ چپ چاپ شام اور تم جیسے ساتھی، ان کی محبتیں، ان کی ہمدردیاں، ان کے پیار، ان کے تپاک۔ میں لٹا نہیں۔ میں تو ایسا آباد ہوا ہوں کہ اب کبھی اجڑنے کا خوف ہی نہیں۔"

دہقان خاموش چلتا رہا، اور دونوں بیلوں کے درمیان الٹی بندھی ہوئی ہل

زمین پر گھسٹتی اور کنکروں سے بجتی چلی گئی۔ کافی دیر کے بعد دہقان بستر کو دوسرے کاندھے پر رکھ کر بولا "کلیجہ پک گیا ہے تم لوگوں کی مصیبتیں سُنتے سُنتے تم مہاجرین لوگ کتنے پیاروں کی لاشیں اُٹھائے پھرتے ہو اپنے دلوں میں! —— ہا ہا —"
اس نے ایک لمبی سانس لی اور پھر پوچھا "پہلے کبھی ہل چلایا ہے؟"

"زندگی ہل چلاتے ہی گذری ہے بھائی" وہ دعوے سے بولا۔

اور دہقان نے پھر سے ایک زناٹے کا قہقہہ لگایا "اس لئے پوچھا ہے کہ یہاں جتنے مہاجرین آئے ہیں اُن کی کچھ عجیب سی حالت ہے۔ مدرسے کے ایک استاد کو یہاں تین کھڈیاں ملی ہیں، اور ایک میراثی کو کپڑے کی دکان، اور نمک مرچ بیچنے والے ایک دبلے سے مہاجرین کو پندرہ بیگھے زمین ملی ہے ایک پہاڑی ڈھلان پر۔ اور میں کہتا ہوں اگر وہ ہل چلانے کی ٹھانے تو وہ ہل نہیں چلائے گا، ہل اُسے چلائے گا!"

دونوں کے قہقہے دھڑاک سے اُن کے پھیپھڑوں سے اُبل پڑے، اور کتّوں کا ایک ہجوم گلی کے موڑ پر اکٹھا ہو کر ان کی مزاج پرسی کرنے لگا۔

"تمہارے ہاں کے گاؤں کی کونسی چیزیں مشہور ہیں"؟ دہقان نے پوچھا۔
"لڑکیوں کا لباس اور نوجوانوں کے گیت"۔ وہ کتّوں سے بچنے کے لئے دہقان کے پہلو ہی میں آکر بولا۔

"اور ہمارے ہاں کے گاؤں کی بھی دو ہی چیزیں مشہور ہیں۔ گالیاں اور کُتّے!"

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا "اور ہاں"۔ وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا "ایک اور چیز بھی۔ گالیاں اور کتے اور جاگیردار"۔

"جاگیردار ہمارے ہاں کے بھی مشہور ہیں"۔ وہ پتھریلی گلی میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے بولا "ہمارے ہاں کے جاگیرداروں نے تو فرعونوں ——"

دہقان نے اچانک جھک کر سرگوشی کی "یہ چوپال ہے، جاگیردار بیٹھا حقہ پی رہا ہے، اُس نے سُن لیا تو تمہارے چمڑے کی جوتیاں بنوائے گا۔ پھر ہوں گی باتیں۔ کہاں ملوگے؟"

"مجھے تو جاگیردار کی چوپال پر ہی جانا ہے"۔ وہ بولا۔ "نائب تحصیلدار نے کہا تھا۔"

"تو بسم اللہ، چلو۔" اس نے بیلوں کو چمکار کر روک لیا، اور چوپال پر جا کر بستر زمین پر پٹخ دیا۔ برتن بج اُٹھے، جیسے پکار رہے ہیں "ہم مہاجرین ہیں"۔

"کون ہو بھئی؟" جاگیردار نے حقّے کی نال پرسے کہا۔

"مہاجرین بھائی ہے"۔ دہقان اس سے پہلے بول اُٹھا۔

"بیٹھ جاؤ"۔ جاگیردار نے آواز حقّے کی نے میں اُگل دی، اور پھر ایک طویل کش سے جیسے مدارات کی یہ چھوڑی ہوئی ابجد پھر سے نگل لی۔ "ہاں تو بات لمبی ہوئی جارہی ہے"۔ وہ بولا۔ "ابّا نے یہ زمین ہرنام سنگھ کو انعام میں دے دی، اور ماں کے —— ہرنام سنگھ نے اس سے وہ سونا نچوڑا، وہ سونا نچوڑا کہ آج بھی کوئی اس کے گھر کا کھنڈر کھودے تو سونے کی اینٹیں پائے۔ میں نے صاحب ضلع کو لکھا ہے کہ اس زمین کا فیصلہ کرتے وقت وہ میرے حق کو ——" جاگیردار اچانک رُک گیا۔ اور پھر گرج کر بولا۔ "تم چوپالیوں سے میں نے ہزار بار کہا ہے کہ جب میں بات کرتا ہوں تو بیچ میں بولنے والے کو اپنے بیٹے کے قاتل کے برابر سمجھتا ہوں، اور یہاں کھسر پھسر ہو رہی ہے ماں کے ——"

وہ لجاجت سے بولا۔" صاحب — میں اس بھائی سے —"

"صاحب"! اب کے جاگیردار کی گرج میں طنز تھا۔" صاحب کی ماں کا — صاحب جا چکا جہاں سے آیا تھا، اب یہ صاحب واب یہاں نہیں چلے گا۔ اب ہم پاکستان میں ہیں۔ اپنا ملک اپنا راج، اپنا سکہ۔ یہاں اب صاحب کی جگہ ملک اور چودھری اور میاں کا حکم چلتا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔" میں اس بھائی سے کہہ رہا تھا کہ اب اپنے بیل سنبھالو، کہیں دور نہ نکل جائیں۔"

"تو کیا آج سے پہلے تم ہی اس کے بیلوں کی دیکھ بھال کرتے رہے ؟" جاگیردار حقے کی نال چھوڑ کر سیدھا ہو بیٹھا۔" بھئی یہ بات مجھے قطعی پسند نہیں کہ جو بھی مہاجر یہاں آتا ہے، وہ پاکستان کو خالہ جان کا گھر سمجھتا ہے، اور حکم چلاتا ہے، گز بھر کی زبان ہوتی ہے سب کی، اور حالت یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ کا نام تک نہیں آتا۔"

"میں دوبارہ معافی چاہتا ہوں حضور۔" اس نے مری مری آواز میں کہا۔" نائب تحصیلدار صاحب نے پرچہ دیا تھا، کہ آپ کو دکھا دوں اور آپ مجھے میری زمین دکھا دیں۔"

"جی ہاں! آپ کا غلام ہی تو ہوں کہ اسی وقت زمین جا کے دکھا دوں گا تمہیں — اونہہ — پرچہ لاؤ۔"

ایک فوجی پنشنر نے ٹارچ جلائی، اور استاد جی جنہیں اس گاؤں میں کھڈیاں ملی تھیں۔ یہ پرچہ پڑھنے لگے۔ اور جب اُنہوں نے ہرنام سنگھ ولد بلرام سنگھ کے الفاظ پڑھے، تو جاگیردار ہڑبڑا کر اُٹھا۔ حقہ گر گیا، اور چلم انگارے بکھیرتی لڑھکتی چلی گئی۔" نائب تحصیلدار کا باپ بھی آ نکلے، تو میں ہرنام سنگھ کی زمین

سے بالشت بھر بھی کسی کو نہ دوں! اور آخر کیوں دوں؟ ابا نے لہر میں آکر اتنی اچھی زمین اٹھا کے ہرنام سنگھ کے حوالے کر دی، ہرنام سنگھ دلی کو بھاگ گیا۔ اب اس کے بعد اگر سرکار یہ زمین مفت خوروں میں بانٹتی پھرے، تو اس کی ماننے گا کون؟

"ماننا ہی پڑے گا حضور" اس نے نہایت یقین سے کہا "یہ ہماری اپنی سرکار کا حکم ہے نا"

"اپنی سرکار! — اپنی سرکار!" جاگیردار زمین پر زور زور سے پاؤں پٹخ رہا تھا "اپنی سرکار اٹھائے پھرتا ہے! سرکار تمہاری ہے تو ہماری بھی تو ہے۔ اور پھر سرکار کا کیا ہے، خضر حیات کے زمانے میں ہم نے لیگیوں کے بیسیوں جھنڈے پھاڑے، تو سرکار نے ہمیں ایک مربع زمین دے دی۔ اب لیگ کا راج ہے تو مربع اسی طرح ہمارے پاس رہا، اور لیگی اپنے گھروں میں پرانے جھنڈوں پر سے گرد جھاڑتے رہ گئے اور کھانڈ کا ڈپو بھی ہمیں مل گیا۔ سرکار جب بھی ہماری تھی، اب بھی ہماری ہے۔ اٹھائے پھرتا ہے سرکار کو! جاؤ نہیں ملے گی یہ زمین" اس نے مروڑی ہوئی پرچی اس کے منہ پر دے ماری "اور پھر خدا جانے تم میراثی ہو یا جلاہے، اور یہاں زمیندار بن کر آنکلے ہو ماں کے —"

"دیکھو جاگیردار جی" وہ اٹھ کھڑا ہوا "اگر آپ نے گالی دی تو میں بھی گالی دوں گا، ہم جلے بھنے آئے ہیں، اب اگر چاہیں تو جلا بھون بھی سکتے ہیں — ہاں"

اور جاگیردار کے اندر جیسے کوئی آتشیں مادہ پھٹ پڑا، گالیوں کا ایک طومار لگا تا وہ آگے بڑھا اور اس کا بستر اٹھا کر نیچے گلی میں پٹخ دیا۔ وہ تپتے ہوئے جسم اور کھولتے ہوئے خون کو لئے چوپال پر سے اترا، بستر کو گھسیٹ کر پیٹھ پر ڈال لیا،

اور جب اوپر جاگیردار تھوک نگلنے کے لئے رُکا تو وہ بولا "مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ پاکستان بھی اپنے اندر آپ ایسے پھوڑے چھپائے بیٹھا ہے، اور جاگیردار جی اگر پاکستان کو زندہ رہنا ہے تو اسے یہ پھوڑے کاٹ کر پھینکنا پڑیں گے۔"

جاگیردار دگنی شدت سے ماؤں بہنوں اور ان کے جنسی اعضا کی گردان کرنے لگا، اور وہ ایک گلی میں مڑ گیا، لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے چوپال کی طرف جا رہے تھے اور جاگیردار کے غضب ناک ہونے کی وجہ کے متعلق خیال آرائی کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی بستی کے خلاف کسی نے اعلانِ جنگ کر دیا ہے، اور اُن کا سردار اُنہیں پکار رہا ہے ۔۔۔ اور وہ نائب تحصیلدار کی دی ہوئی پرچی کو مٹھی میں دبائے بڑھتا چلا گیا، کتّے اس کے پیچھے بھونکتے ہوئے آتے اور تھک کر اور دُمیں گرا کر واپس چلے جاتے۔ بچے اس کے پاجامے اور اونچی قمیص کی جھلک پا کر اس کے ساتھ ساتھ چلتے اور لوٹ جاتے، اور پھر اچانک پیچھے سے کوئی بھاگتا ہوا آیا اور اس کی پیٹھ پر سے بستر اُچک لیا۔ اب وہ تن کر پلٹا، جیسے چھیننے والے کی ہڈیوں تک کو چُر مُر کر کے رکھ دے گا، نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبائے وہ اکڑی ہوئی انگلیوں سے اس پر جھپٹا۔ اور اُس کے بازو کو جکڑ لیا۔ مگر اچانک اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے، اُسے سرگوشی سنائی دی "ڈرو نہیں، میں شیرا ہوں، میرے ساتھ چلو۔ مجھے پہلے سے خوف تھا کہ یہ پرچہ جاگیردار کے تلوے میں فتیلہ بن کر جل اُٹھے گا۔ میں نے بیل باندھ کر جاگیردار کا شور سنا تو گلی گلی میں بھاگتا پھرا تمہارے لئے، اور اب یہاں ملے ہو تم، جاگیردار کے مزارعوں کے محلے ہیں۔ ان لوگوں کو پتہ چل گیا تو تمہیں نوچ کر دھر دیں گے، تیز تیز قدم اُٹھاؤ، اب تم میرے پاس رہوگے،

اور کسی نے تمہیں آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو اس کی ماں ——"

وہ دہقان کے ساتھ اونچی نیچی ہرتی پھرتی گلیوں میں پکا چلا گیا، اور جب اس کے گھر میں پہنچا تو آن کی آن میں اس کی ساری برادری لٹھیں اور کلہاڑے لئے اس کے ارد گرد جمع ہو گئی، ماؤں بہنوں اور اُن کے جنسی اعضاء کی گردانیں یہاں بھی دہرائی گئیں، اور دہقان نے اُسے کھانا کھلا کر نہائت محبت سے نواڑ کے پلنگ پر سلا دیا۔

جب وہ صبح کو اٹھا تو صحن میں سنہری دھوپ پھیل رہی تھی، اور ایک کونے میں دہقان کی بیوی دودھ بلو رہی تھی۔ "بھائی کہاں ہے؟" اُس نے کہنی کے بل اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بلونے کو ڈھیلا چھوڑ کر بولی "آپ کے لئے نیا ہل بنوانے گیا ہے بڑھئی کے ہاں۔ کہتا ہے، آج آپ اور وہ مل کر ہرنام سنگھ کے کھیت میں ہل جوتیں گے!"

وہ مسکراتا ہوا بستر سے اُٹھا، تو وہ بولی "ٹھہریئے، لسّی پی لیجئے گا باہر جانے سے پہلے۔"

"باہر کون جاتا ہے بہن" وہ ہنستے ہوئے بولا "سکھوں سے بچ کے آیا ہوں، اب اپنے مسلمان بھائیوں سے کھوپڑی ادھڑوانے کا ارادہ نہیں میرا، چند دنوں زندہ رہنا چاہتا ہوں!"

"نہیں نہیں" وہ بولی "آپ بے فکر رہئے۔ جاگیردار کے بہت سے مزارع نماز کے بعد یہاں آئے تھے، کہہ گئے ہیں کہ جاگیردار نے آپ کو ہل چلانے سے روکا، تو اُن کے برچھے ہوں گے اور جاگیردار کی توند!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ادھر سے شیرا آ نکلا، نئے نئے ہل کو کونے میں رکھ کر وہ اس کی طرف آیا اور بولا "میں نے ہر دکان سے لوہے کے کوکے پوچھے، مگر کہیں سے نہیں ملے۔ ارادہ تھا کہ تمہارے ہل کی ہتھی پر کوکے لگا کے اُسے بالکل نقرئی بنا دیتا، جو دھوپ میں چمکتے تو جاگیردار کی آنکھیں چندھیا جاتیں"۔

"یہ میرا ہل ہے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، یہ تمہارا ہی ہل ہے"۔ اس نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور جاگیردار کے مزارعوں نے کہا ہے کہ اگر ——"

"مجھے بہن بتا چکی ہیں"۔ وہ بولا۔

"لسی پی ہے؟"

"پی لوں گا"۔

"لسی پی لو تو چل کر کھیت میں ہل کی بسم اللہ کریں"۔

"ابھی چلتے ہیں"۔

"خوف کی کوئی بات نہیں"۔

"نہیں۔ تم جو میرے ساتھ ہو"۔

"پڑوس سے میں نے تمہارے لئے بیل مانگے ہیں دو دنوں کے لئے، وہ لیتا آؤں"۔

"لے آؤ"۔

"حقہ پیو گے؟"

"پی لوں گا۔"

اور شیرے نے لپک کر کونے سے حقہ اُٹھایا، تازہ پانی ڈالا، ہاتھوں کو جھاڑ پونچھ کر تمباکو مَسلی، اور پھر تمباکو سُلگا کر اور حقہ اس کے پاس رکھ کر صحن سے نکل گیا۔

اور وہ سوچنے لگا کہ اگر حکومت اُسے ہرنام سنگھ کے کھیتوں کی بجائے صرف شیرے کی محبت اور شفقت اور رفاقت دے دیتی، جب بھی وہ اس کا ممنون ہوتا، یہ سونے کی طرح چمکیلی اور مکھن کی طرح نرم دوستی، جس کا ضمیر بہاروں اور ستاروں کے رنگ و نور کا مرکب ہے۔ رہتک سے لیکر داگھہ کی تمام بربادیاں، بے آبروئیاں اور بے دست و پائیاں، جو اس کے دماغ میں گہری خراشوں کی طرح ایک ابدی کسک کے ساتھ نمایاں تھیں مٹنے لگیں، جاگیردار کی کف آلود گالیوں نے ایک جنونی کی بڑ کی صورت اختیار کر لی، اور اُس نے باہوں کو تان کر اور ٹانگوں کو پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی اور ایک طویل سانس کے ذریعے اس نے اپنی روح اور جسم میں سے سارا زہر نکال کر باہر پھینک دیا، ہلکا پھلکا ہو کر وہ حقے پر جھکا، مگر اب تک تمباکو بجھ چکی تھی۔ مُسکرا کر وہ بل کے پاس گیا، اور اُس پر یوں ہاتھ پھیرا، جیسے بل متاثر ہو کر اپنی دم ہلانے لگے گا۔ پلٹا تو دہقان کی بیوی لسّی کا گلاس لئے کھڑی تھی۔ وہ پی چکا تو صحن میں دو بیل داخل ہوئے، جن کے کھُروں کی دھمک سے جیسے صحن چٹخ جائے گا۔

"کیسی جوڑی ہے؟" دہقان نے مسکرا کر پوچھا۔

"طوفان ہے۔"

"میں چاہتا ہوں، ذرا جاگیردار کو پتہ تو چلے کہ تم اکیلے نہیں ہو۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا مگر فرطِ مسرت سے اس کی آواز گھٹ گئی اور وہ جُوا اٹھا کر بیلوں کی طرف بڑھا، ادھر چھپر کے تلے سے دہقان اپنی جوڑی نکال لایا۔ طرفین زور زور سے ڈکرائے، اور صحن میں بچوں کا ایک ہجوم ہو گیا، ہل کاندھوں پر رکھے مشرق و مغرب کے یہ دو دہقان بیل لیئے گلی میں آئے، اور جب چوپال کے قریب سے گذرے، تو جاگیردار نائب تحصیلدار کی اچانک آمد پر مرغے ذبح کرا رہا تھا۔ اس نے خون آلود آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ اور پھر مرغوں کو ذبح کرتے ہوئے موچی کو ماں کی گالی دے کر بولا " ابے چھری چلا اور قصہ پاک کر، چھری اٹھا کر یوں کلام پڑھنے لگتا ہے، جیسے سارا قرآن مجید ختم کر کے دم لے گا ماں کا ــــ"

اور ایک تڑپتا ہوا نیم بسمل مرغا چوپال پر سے اچھل کر نیچے گلی میں خون اور خاک اڑانے لگا۔

ہرنام سنگھ کے کھیت ہتھیلی کی طرح صاف تھے، آن کی آن میں دونوں نے کھیتوں کو الٹ پلٹ کر دھر دیا۔ نئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے ہوا بوجھل ہو کر جیسے جھومنے لگی، اور جب سائے مشرق کی طرف رینگنے تو دہقان کی بیوی کھانا لے کر آگئی۔ گندم اور باجرے کی روٹیاں، مکھن اور لسّی، اچار اور بیر!

اور جب وہ فاتحانہ شان سے گاؤں کو پلٹے تو راستے میں انہیں چوکیدار ملا۔ نائب تحصیلدار نے اُسے چوپال پر بلایا تھا ــــ دونوں نے چوپال کا رُخ کیا۔ اور ہانپتے ہوئے بیلوں کو بھری چوپال کے سامنے روک کر اُس نے نائب تحصیلدار کو سلام کیا، اور ایک رجسٹر پر انگوٹھا لگا کر اور جاگیردار پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر وہ چوپال سے اُتر آیا، اور دونوں بیل ہانکتے گلی میں مڑ گئے، اور حیرت زدہ

دہقان دیر تک ان کے بارے میں سرگوشیاں کرتے رہے، اور جاگیردار دیر تک جی ہی جی میں اپنے ابّا کو کوستا رہا، جس نے لہر میں آ کر زمین ہرنام سنگھ کے حوالے کر دی۔ "مگر خیر۔ دیکھا جائے گا" مونچھوں کی نوکیں مروڑتے ہوئے اس کے انداز پکار پکار کر کہتے۔

اور ادھر ہرنام سنگھ کے کھیتوں میں چند دنوں کے بعد باجرے اور جوار کے ذرا ذرا سے پودے جھانکنے لگے۔ ہر طرف مخمل سی بچھ گئی۔ لوگ بھیڑوں بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کو ان کھیتوں سے بچا کرلے جاتے اور کہتے "مہاجرین کی فصل ہے ایک تنکا تک حرام ہے تم پر" ------ کبھی کبھی جاگیردار اُن پہاڑوں پر تیتروں کا شکار کھیلنے آتا، جن کے قدموں میں اس کے کھلے کھیتوں سے ملحق ہرنام سنگھ کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک اپنی ایک مونچھ کا سرا دانتوں میں دبائے سوچتا رہتا، اور پھر ہوا میں فائر کر کے زور زور سے ہنستا ہوا، اپنے ساتھیوں کی پیٹھیں ٹھونکتا پرلی طرف اتر جاتا۔

ایک روز وہ تڑکے اپنے کھیتوں میں آیا تو بہت سی بھینسیں اور گائیں فصل کے نئے نئے خوشوں پر دعوت اڑا رہی تھیں۔ وحشت زدہ ہو کر وہ اُن پہ پل پڑا، اور انہیں بھگاتا ہوا بڑے راستہ پر آیا۔ جہاں شیرا اپنے کھیتوں کی بنیڈوں پر سے گھاس کاٹ کر رہا تھا۔

"تمہارے کھیت میں تھیں یہ سب کی سب؟" اس نے درانتی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اس کی آواز میں فریاد تھی "جہاں جہاں منہ مارا ہے، چٹیل کر کے رکھ دیا

ہے کھیت کو۔"

"تو انہیں کہاں لئے جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں۔ یہیں بڑے راستے پر چھوڑ دوں گا۔"

"تھانے کیوں نہیں جاتے؟"

"تھانے؟"

"ہاں ہاں۔ اِن کو کانجی ہاؤس میں بند کرا آؤ۔"

"کس کی ہیں یہ؟"

"جاگیردار کی۔"

"جاگیردار کی؟ ـــــ تھانے کا راستہ بتاؤ۔"

"دونوں چلتے ہیں۔"

اور وہ بھینسوں اور گایوں کو ہنکاتے دو تین میل دور قصبے میں آئے اور انہیں کانجی ہاؤس میں بند کر دیا۔

علاقے بھر میں ایک ہڑا سا مچ گیا، اتنے بڑے جاگیردار کے مویشی اور کانجی ہاؤس میں! جیسے جیل خانے صرف غریبوں کے لئے اور کانجی ہاؤس صرف غریبوں کے مویشیوں ہی کے لئے تو بنے ہیں! ـــــ اور جب وہ دونوں گاؤں میں پہنچے اور جاگیردار کے مویشیوں کی خبر سُنائی؛ تو جاگیردار کے مزارعے بھاگے بھاگے آئے۔ اور ان کو مبارکبادیں دیں، اور کہا۔ "کیوں بھئی، جاگیردار کی زمینیں کیا آسمان سے اُتری ہیں، اور ہمارے تمہارے کھیت چر رہے ہیں کیا! کہ جو بھینس گائے بھٹکے یہیں آ کر دم لے، ایسا سبق پڑھایا ہے تم نے جاگیردار کو کہ اپنے بیٹے کو بھی نصیحت

کر جائے گا، ہاتھ ملاؤ"۔

سارا گاؤں حیران تھا کہ آخر جاگیردار نے ایسی زبردست ہتک پر چُپ کیوں سادھ لی ہے، یہ وہی جاگیردار تو ہے جس نے الیکشن کے زمانے میں خضرِ حیات کی آمد پر جب سارے گاؤں کو ایک سنہری دروازہ کھڑا کرنے کو کہا تھا۔ اور چند نوجوانوں نے انکار کر دیا تھا، تو اُس نے انہیں فوراً تھانے بھیج دیا، اور تھانیدار کو کہلا بھیجا۔ کہ ان پر کوئی سا مقدمہ چلا دو۔ یہ کم بخت پاکستان کے حق میں ہیں۔ اور پھر جب اس کے بیٹے کی شادی پر ایک غریب گڈریئے کا پرنالہ کجاوے کے ساتھ اُلجھا چلا آیا تھا۔ اور گڈریئے نے نیا پرنالہ مانگا تھا، تو دوسرے روز صبح کو گڈریئے کی ساری بھیڑیں باڑے میں ڈھیر پڑی تھیں، ـــــ یہی جاگیردار اب ایک منحنی سے مہاجر سے کیسے دب گیا؟

"کوئی طوفان آنے والا ہے"۔ شیرا مہاجر سے کہتا۔

اور وہ بے پروائی سے ہنس کر جواب دیتا "ہم نے لہو کے سیلاب میں کشتیاں چلائی ہیں بھئی۔ ہم اس جاگیردار کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے، اور اب سب جاگیریں ہم لوگوں میں بٹ جانے والی ہیں"۔

"ہم لوگوں میں بٹ جانے والی ہیں جاگیریں؟" شیرا حیران ہو کر کہتا۔ اور تعجب اور مسرت کے سیلابی جذبات سے وہ گھگھیانے لگتا "یعنی ـــــ یعنی ـــــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ـــــ جاگیردار کی جاگیر ـــــ جاگیردار کی جاگیر نہیں رہے گی؟"

"آثار تو ایسے ہی ہیں"۔ وہ کہتا "اور شاید یہی وہ طوفان ہے جو آنے والا ہے"۔

"بھئی ایسے طوفان کے صدقے جاؤں"۔ دہقان حقّے کا بھرپور کش لگا کر کہتا، اور بیل ڈکرا کر اس کا ساتھ دیتے۔

ساون کے ابتدائی دنوں میں معمولی سی بارش سے دہقان اس قابل ہوئے تھے کہ جوار باجرہ بو سکیں۔ اس کے بعد آسمان چٹیل سا ہو کر رہ گیا تھا، سارا ساون بادلوں کی راہ تکتے گزر گیا۔ مغربی پربت پر سے کوئی بدلی اٹھتی بھی تو چوٹی سے چمٹ کر رہ جاتی، صبح کر وہ چوٹی سے اتر کر نشیب کا رُخ کرتی۔ اور پربت کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل میں ڈوب کر کھو جاتی۔ منتیں مانی گئیں، مزاروں پہ چراغ جلائے گئے، اور قبرستان کے درختوں کی ٹہنیاں سُرخ اور سبز دھجیوں سے پٹ گئیں، بیرجی نے ہوا کے رُخ پر ایک شاداب درخت سے تعویذ بھی لٹکایا، اور کنکروں پر دم کر کے انہیں کنوؤں میں بھی پھینکا، مگر بادل عنقا ہی رہے، فصلوں میں بچھی ہوئی مخمل پر گرد سی جمنے لگی، اور کونپلوں کی نوکیں سنہری ہونے لگیں۔ اور اب بھادوں کی آخری تاریخیں تھیں، شیرا اپنے صحن کے مرے پہ بیٹھا بچوں میں گھنگھنیاں بانٹ رہا تھا، اور مہاجر تسبیح پہ کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ اچانک کہیں دُور سے دبی دبی گرج سُنائی دی۔ ایک دم سارا گاؤں چونک کر اُٹھا، اور گلیوں میں اور چھتوں پر جمع ہو گیا۔ شیرے کو دوسری طرف متوجہ پا کر بچوں نے گھنگھنیوں کے دیگچے پر ہلّہ بول دیا، اور مہاجر تسبیح کو پلنگ کے پائے سے لٹکاتا اُچک کر دیوار پر کھڑا ہو گیا۔

"بادل اُتر سے اُٹھا ہے"۔ وہ خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"تو پھر کدال سنبھالو"۔ دہقان بچوں کے جھرمٹ میں سے دیگچا کھینچتے ہوئے بولا۔ "تمہارے کھیتوں میں تو پہاڑ سے اتنا پانی آئے گا کہ باجرہ گل کر ہی نہ رہ جائے

—— کہاں ہے بادل؟" اور وہ بھی دیوار پر آگیا۔

دور اُتری پہاڑیوں پر ہلکی ہلکی بجلی چمک رہی تھی، اور ہوا میں خنکی سی رچ رہی تھی۔

"بادل ادھر ہی آرہا ہے۔" شیرا چہکا۔

"نہیں۔" پڑوس کی چھت سے ایک بوڑھا بولا۔" وہیں رُک گیا ہے۔"

"تیرے منہ میں انگارہ۔" شیرے نے جل کر کہا۔

"اور تیرے منہ میں مکھانے —— صرف اگر بادل یہاں تک آجائے۔"

"گواہ رہنا بھائیو۔" شیرے نے چلا کر سارے محلے کو مخاطب کیا۔" بچا نے مکھانوں کا وعدہ کیا ہے!"

دُور دُور سے قہقہوں کی آوازیں آئیں، اور جب یہ طوفان رُکا تو اچانک بوڑھا ماتھے پر ہاتھ مار کر پکار اٹھا۔" ہائے رے نصیب۔ میں تو شرط ہار گیا۔ بادل تو ادھر ہی آرہے ہیں۔" اور پھر اس نے تہمد کے کونے سے اٹھنّی نکال کر شیرے کے منہ پر دے ماری۔

"پھول ہے پھول"۔ دہقان قہقہے لگاتا تالیاں پیٹتا اٹھنی کے لئے نیچے گلی میں کود گیا، اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد دھوپ غائب ہو گئی، درختوں کی ٹہنیاں جاگ اُٹھیں، سبزے کا رنگ نکھر آیا، اور کہر اُڑ کر جیسے دالانوں میں ناچنے لگی،

"کدالیں اٹھاؤ"۔ شیرا چلایا۔" پوربی کونے میں رکھی ہیں۔"

وہ اندر گیا اور کدالیں اٹھا لایا، پاجامہ گھٹنوں تک چڑھا لیا، اور آستینیں اڑس لیں، اوپر سے بادل دہاڑ کر پھٹا، اور جلی ہوئی مٹی نے خوشبو کے طوفان اچھال دیئے۔ ننگ دھڑنگ بچے گلیوں میں بھاگنے لگے۔ باڑوں میں بھیڑیں بکریاں ممیا اٹھیں،

ہر گھر میں اُٹھا پٹخ شروع ہو گئی، اور دہقان کدالیں سنبھالے بھاگتے ہوئے اور ہنستے ہوئے اور چھینٹے اڑاتے ہوئے ایک دوسرے کے پاس سے گذرنے لگے۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے بڑے راستے پر آئے، شیرے نے اپنے کھیت کا رُخ کیا، اور وہ اپنے کھیت کی طرف لپکا، موسلا دھار مینہ برس رہا تھا، چند قدم آگے بڑھا تو شیرے کو گنجان بوندوں نے چھپا لیا، گرج اور چمک اور چھاجوں پانی۔ پگڈنڈیاں ندیاں بن گئی تھیں، اور ندیاں اینڈ اینڈ کر دوڑتی پھرتی تھیں، اور وہ کدال سنبھالے بھاگتا گیا۔ سب کھیت تالابوں میں بدل چکے تھے۔ صرف مینڈوں کے حاشیئے نمایاں تھے۔ مینڈوں پر ہوتا ہوا جب وہ اپنے کھیت کی مینڈ پر پہنچا، تو اچانک دم بخود ہو کر رک گیا، اور کدال اُس کے ڈھیلے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ اس کے کھیت میں جگہ جگہ پانی رینگ رہا تھا، مگر وہ تالاب والی کیفیت نہیں تھی۔ "میرے حصّے کا پانی کہاں جا رہا ہے؟" اس کی حیران آنکھوں نے پہلے تو جھکی ہوئی گھٹا سے اور پھر ملحقہ پہاڑ سے اور پھر خود کھیتوں سے پوچھا، اور کچھ دیر تک بت کی طرح کھڑا رہ کر اس نے کدال اُٹھا کر کاندھے پر دھر لی "آخر میرے کھیتوں کا پانی کہاں غرق ہو رہا ہے؟" اُس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پہاڑ کی طرف بڑھا، چوٹی پر جا کر اس نے دیکھا کہ اُتری افق پر بادل چھٹ رہا تھا۔ دیوانہ وار اس نے نیچے نظریں دوڑائیں، سارے پہاڑ کا پانی ایک مصنوعی ندی کی شکل میں ایک قوس کی صورت اختیار کر کے نیچے جا رہا تھا —

وہ غیر معمولی تیزی سے مصنوعی نالی کے کنارے کنارے نشیب کی طرف بھاگا۔ اور جب رُکا، تو وہ جاگیردار کے وسیع کھیتوں کے کنارے کھڑا تھا، اور سارے

پہاڑ کا پانی جاگیردار کے کھیت ننگے جا رہے تھے۔ پہلی بار اس کے منہ سے جاگیردار کے لئے گالی نکلی۔ اور پھر کچھ اس تیزی سے کدال چلائی کہ آن کی آن میں پہاڑی پانی کے آدھے حصّے نے اس کے کھیتوں کا رُخ اختیار کر لیا۔

ایک گرجدار قہقہہ لگا کر اس نے کدال ایک طرف پھینک دی۔ اور اُچک کر ایک چٹان پر جا بیٹھا، بارش تھمنے لگی تھی، مگر پہاڑی پانی کی شدت بدستور تھی۔ جلد ہی اس کے کھیتوں کا نصف حصّہ سیراب ہو گیا، اور ابھی پانی بڑھ رہا تھا، اور مصنوعی نالیاں گونج رہی تھیں۔

بارش تھم گئی، کہیں کہیں دھوپ کے دھبے بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر پہاڑی نالیاں بارش کے بعد ہی تو لہریں آتی ہیں، وہ بدستور گرج رہی تھیں، اور وہ اسی چٹان پر بیٹھا سامنے پہاڑی پر بکھرے ہوئے گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا، جس کے خاکستری گھروندے دُھل جانے کے بعد اجنبی سے معلوم ہو رہے تھے اور مانوس سے بھی۔

اور پھر وہ دور مغربی پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی میں پیوست سنہری سورج کی طرف دیکھ کر مُسکرایا، دہقان کاندھوں پر کدالیں رکھے پگڈنڈیوں پر سے ہوتے ہوئے بڑے راستے کی طرف آ رہے تھے، اور گاؤں کے تنوروں میں سے دھوئیں کے بہت سے مینار بلند ہو رہے تھے۔ زندگی میں دوسری بار اُسے ایک عجیب سا خیال آیا، کاش ان میناروں میں سیڑھیاں ہوتیں اور وہ لپک کر ایک مینار کی چوٹی پر جا نکلتا اور دھوئیں کے پردے سرکا کر شریر بچوں کی سی سیٹیاں بجاتا اور تالیاں پیٹتا اور چلاتا۔

"میں وہی ہوں جاگیردار جی، جس کو آپ نے چوپال پر سے دھتکار دیا تھا۔ وہی آج اس دودھیا مینار کی بلندی پر سے آپ کو پکار رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ مزاج تو اچھے

ہیں آپ کے!"

اور اس نے فاتحانہ قہقہہ لگا کر کئی ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ پر سے اترتے ہوئے جاگیردار سے پوچھا۔ "کہئے۔ مزاج تو اچھے ہیں آپ کے!"

جاگیردار کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ کدال اُٹھانے کیلئے چٹان پر سے کودا۔ مگر جاگیردار کے ساتھیوں نے جھپٹ کر اُسے دبوچ لیا اور جاگیردار نے بڑھ کر اور اس کی ماں کو یاد کر کے اس کی پسلیوں میں دو تین گھونسے جما دیئے، وہ بل کھا کر گرا تو اس کے پیٹ پر زور سے ٹھوکر لگائی اور پھر ایک من چلے نے اس کی ناک پر پتھر کھینچ مارا۔ وحشیوں کی طرح اس نے ادھڑے ہوئے گالوں اور پھٹی ہوئی ناک کو اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے نوچ ڈالا اور پھر اس کا خون آلود ہاتھ ڈھیلا پڑ کر ایک پتھر پر جا گرا اور چڑیوں کا ایک غول فضا میں سے اتر کر اس کے سر پر ایک سنناتی قوس بناتا اوپر اُبھر گیا —— اور جب اس کی آنکھ کھلی تو صاف آسمان پر چاند اور ستارے چمک رہے تھے اور ہر طرف مینڈکوں نے شورِ محشر بپا کر رکھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک چپ چاپ لیٹا چاند اور ستاروں کو دیکھتا رہا اور مینڈکوں کا شور سنتا رہا۔ اور پھر اچانک ہڑبڑا کر اٹھا۔ مگر تیورا کر بیٹھ گیا۔ اور اس کی ناک سے بہتا ہوا خون اس کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر سے ہوتا اس کی قمیص میں جذب ہوتا رہا، —— اور لبریز کھیتوں میں چاند نہا رہا تھا —— اور ستارے ڈبکیاں لگا رہے تھے —— اور ہوا جیسے نمناک ریشمی چادریں فضا میں لہراتی پھرتی تھی —— کچھ دیر کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی کدال غائب تھی۔

لپک کر وہ پہاڑی نالی کے پاس آیا۔ تھوڑا تھوڑا پانی اب بھی جاگیردار کے کھیتوں

کی طرف بہا جا رہا تھا، کنکروں کا ایک ڈھیر لگا کر اس نے پانی کی دھار کا رُخ بدل دیا ــــ "ادھر آؤ" وہ زخمی انگلیوں سے پتھریلی زمین کو کریدتا ہوا چمکتی ہوئی دھار کو بلانے لگا " اس طرف آؤ۔ اُن کھیتوں میں کسانوں کی لاشیں اُگتی ہیں۔ اِدھر ان کھیتوں میں آؤ۔ جن کے بوتے پر کسان زندہ ہے، انسان زندہ ہے۔ پاکستان زندہ ہے ــــ ادھر آؤ" وہ ناک سے ٹپکتے ہوئے لہو کو آستین سے پونچھتا اور اُنگلیوں کی پوروں سے رستے ہوئے خون کو پتھروں پر ملتا چلا گیا "ادھر میرے کھیت میں آؤ۔ اور نورے کے کھیت میں، اور بیگ کے کھیت میں، اور نواز کے کھیت میں، اور شیرے کے کھیت میں اور ــــ"

اور دور چاندنی سے دُھلی ہوئی پہاڑی پر سے شیرا "بھیّا۔ او بھیّا" پکارتا ہوا لپکا آ رہا تھا۔

سپاہی بیٹا

یہ علاقہ فوجی بھرتی کی سدابہار فصل تھا، ان گنت گھروں میں مانگیں بگاڑی اور چوڑیاں توڑی جا چکی تھیں، بچّوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں یتیمی کی ریت گھس گئی تھی اور اچھے خاصے سیدھے سیدھے چلنے والے بزرگوں کی کمریں جھک گئی تھیں، لیکن بھرتی بدستور زوروں پر تھی، اور پھر بھرتی میں اس شدت کی کشش تھی کہ وہ نوجوان جو اپنے کھیتوں کے تنہا رکھوالے تھے نلائی کے بہانے گھروں سے نکلے اور ہلوں اور بیلوں کو کھیتوں میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہفتوں کے بعد سکندرآباد یا لکھنؤ سے اُن کی چھٹیاں آتیں کہ وہ ماں باپ اور بھائی بہن کو فاقوں سے مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے اس لئے فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں اور — جنگ ابھی انڈیا سے دور ہے، اور آتے وقت میں ماں کی دواؤں کی پوٹلی چھینکے پر رکھنا بھول گیا تھا، وہ کوٹھے کے دکھنی کونے میں برتنوں کی پالی پر دھرے ہوئے سرپوش

میں رکھی ہے اور باقی یہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔ اور آپ سے عرض ہے کہ پیرِ دستگیر کا واسطہ مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ منی آرڈر باقاعدہ بھیجوں گا فکر نہ کرنا۔ اور ہرنام سنگھ سے بعد سلام کے کہنا کہ اب ایک ہی برس میں سارا قرضہ چکا دیا جائے گا۔ اور ہرنام سنگھ کی بکریوں کا خیال رکھنا" ـــ بھرتی کی ہر کھیپ کے ساتھ ذیلدار کے گھر میں سندوں کا ایک انبار جمع ہوتا گیا۔ اور انگریزی ٹوپ والے صاحبوں کی تعداد بڑھتی گئی، ہر ہفتے کسی نہ کسی گلی کا چوراہا اُجڑ کر رہ جاتا، کچی دیواروں پر تڑپتی ہوئی مندریں اور سنہری نودمیدہ مونچھیں اور ململ کے لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے چولے اور ٹیڑھی نوکوں والے گلابی جوتے اور جوانی سے لدے ہوئے چہرے چھٹے رہ جاتے اور پنہاریاں گھڑوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ان چوراہوں پر یوں ٹھٹک ٹھٹک جاتیں جیسے شادی والے گھر میں سے اچانک ڈھولک چوری ہو گئی ہو۔

اس روز بھی گاؤں سے آٹھ نوجوان پیش ہوئے، ایک کی آنکھ پر ذرا پھولا سا تھا، اس لئے ڈاکٹری میں رہ گیا، مگر بڑے صاحب نے وعدہ کیا کہ اگلے دورے میں اسے ضرور بھرتی کر لیا جائے گا "شست باندھنے والی آنکھ پر پھولا سہی مگر جنگ میں نشانے نہیں باندھے جاتے، بس گولی چلائی جاتی ہے" ـــ چوپال پر ان نوجوانوں کی مائیں اور بہنیں جمع ہو گئی تھیں، انہوں نے چہروں کو دوپٹوں میں لپیٹ رکھا تھا مگر آنکھیں ظاہر تھیں۔ اور ان آنکھوں کی چمک مر رہی تھی۔ پپوٹوں کے ساتھ ساتھ نمی کے حاشئے تھے اور ادھ کھلے ہونٹوں پر پیاسیں تھیں، دونوں جوانوں کی بیویاں گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے کنکروں سے زمین کرید رہی تھیں،

ان میں سے ایک کے سامنے بیٹھا ہوا بچہ خواہ مخواہ ہنس رہا تھا اور تالیاں بجا رہا تھا۔

ساتواں نوجوانوں کو زمین پر بیٹھ جانے کا حکم ملا تو ساتوں کی مائیں بہنیں اور بیویاں کھڑی ہو گئیں اور ہنستا ہوا بچہ ماں کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ ماں نے اسے اُٹھا لیا تو وہ پیلی پیلی باچھوں والی ایک لالی کی طرف دیکھنے لگا جو چوپال کی منڈیر پر کھلونے کی طرح جمی بیٹھی تھی، پھر بڑے صاحب نے تقریر کی جس میں اس گاؤں کے دلیر اور جری نوجوانوں کی تعریف تھی، کس طرح سنہ ۱۴ء کی لام میں اس گاؤں کے چوراسی نوجوان فرانس اور میسوپوٹیمیا میں کام آئے، اور تین نوجوانوں کو تمغے ملے، انہوں نے ثابت کیا کہ اس دوسری بڑی جنگ میں پہلی لام سے کہیں زیادہ تمغوں اور انعاموں کی گنجائشیں ہیں، تنخواہوں اور الاؤنسوں میں مزید اضافے کے وعدے کرنے کے بعد وہ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور بچہ پیلی باچھوں والی لالی کی بجائے بڑے صاحب کو دیکھنے لگا وہ بولے۔

"ماؤں اور بہنو، تم بالکل بے فکر رہو، اپنے بادشاہ سلامت کی آن پر قربان ہو جانا ہر مذہب میں جائز ہے۔ تمہارے بیٹے اور بھائی تمہارے گھرانوں کے نام اونچے کرنے جا رہے ہیں۔ جب یہ واپس آئیں گے تو ان کے پاس تمغے ہوں گے اور سندیں ہوں گی اور عزت ہو گی"

"اور اگر واپس نہ آئے؟" بچے والی عورت نے پاس والی عورت سے پوچھا۔

اس عورت نے یہ سوال آگے چلا دیا "سچ مچ اگر یہ لوگ —— میری زبان

جل جائے — واپس نہ آسکے تو؟ —"

یہ سوال سب عورتوں میں چکر کاٹ گیا۔ اور پھر ایک بڑھیا نے زبان کو مسوڑوں پر بجاتے ہوئے بلند آواز میں کہا "صاحب جی، اگر ہمارے بچے واپس نہ آسکے تو؟"

"تو گھر والوں کی پنشن بندھ جائے گی" صاحب نے جواب دیا۔

اس جواب سے کوئی اور سوال پیدا نہ ہوسکا۔

پیلی باچھوں والی لالی اڑ گئی اور صاحب بیٹھ گئے!

بھرتی کرنے اور بھرتی ہونے والا جتھا جب چوپال سے نکل کر واپس جانے لگا تو ایک لمبی گلی کے سرے تک گاؤں والے اُن کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر وہ ساتوں نوجوانوں کو سینے سے بھینچ بھینچ کر پلٹنے لگے اور گاؤں کی آخری گلی میں صرف ذیلدار الوداع کہنے کے لئے باقی رہ گیا اور جب وہ بھی بھرتی کرنے والوں سے جھک جھک کر اور بھرتی ہونے والوں سے تن تن کر ملتا واپس چلا گیا تو کہیں سے کسی عورت کی گھگھیاتی ہوئی آواز سُنائی دی "بھرتی والے صاحب جی!"

جتھا رُک گیا۔ اور جب دوسری بار بھی یہی آواز سُنائی دی تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت دور ایک موڑ پر کھڑی انہیں دونوں ہاتھوں سے اُدھر آنے کا اشارہ کر رہی تھی، انہوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک صاحب کو نئے بھرتی ہونے والوں کے ساتھ ساتھ جانے کی ہدایت کر کے مُسکراتے ہوئے عورت کی طرف چلے۔

وہ عام دیہاتی عورتوں کی طرح تھی، چالیس کے لگ بھگ کا سن ہوگا، مگر

چہرے پر نئی نئی جھرّیاں کچھ اس طرح اُبھر رہی تھیں جیسے انہیں مل دیا جائے تو غائب ہو جائیں، کنپٹیوں کے چند بال سفید تھے اور رنگ دن کے چاند کی طرح میلا میلا سا تھا، بے رونق ہونٹوں پر بے شمار عمودی لکیریں تھیں، ہاتھوں کی نیلی نیلی رگیں اُبھر آئی تھیں اور انگلیوں کی جڑوں کا رنگ کچھ ایسا تھا جیسے چند ہی روز پہلے ان سے انگوٹھیاں اور چھلّے اُتارے گئے ہیں، وہ کچھ یوں دیکھ رہی تھی جیسے کسی کو پہچان نہیں پا رہی، بھرتی والی ٹولی اس کے قریب پہنچی تو وہ مسکرا رہی تھی، یہ ایک عجیب مضمحل مسکراہٹ تھی، کچھ ایسی ڈھیلی ڈھالی اور لٹکی لٹکی سی جیسے ابھی زمین پر ٹپک پڑے گی اور اس کے ہونٹوں پر بے شمار عمودی لکیروں سے لہو پھوٹ پڑے گا!

"کیا بات ہے مائی؟" بڑے صاحب نے پوچھا۔

اُس نے بغیر کسی جھجک کے بڑے صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بڑی غریب ہوں صاحب جی"۔ وہ ہونٹوں کو کچھ یوں بل سے دیتی تھی جیسے مسکراہٹ کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ "اتنی غریب ہوں صاحب جی، کہ آج مجھے گھن لگے چنے کھانے پڑے، جب سے پیٹ میں جیسے کیڑے رینگ رہے ہیں، گھن لگے چنوں میں چنا تو ہوتا ہی نہیں، صرف چھلکا ہوتا ہے اور چھلکا بھی ایسا کڑوا جیسے کریلا!"

بڑے صاحب نے عورت کو ٹوکا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ پہلے ہی چھڑا لیا تھا، اس لئے اب پلٹ جانے کا انداز اختیار کرتے ہوئے بولے "بھیک تک مانگنے کا ڈھب نہیں آتا جاہلوں کو۔"

عورت مسکرائے جا رہی تھی۔ "خفا نہ ہو صاحب جی، بھیک نہیں مانگنی ہے، لڑکا بھرتی کرانا ہے"!

سب صاحب مسکرائے۔

"وہ بہت شرمیلا ہے، سب کے سامنے آنے سے گھبراتا ہے، کہتا ہے اگر بھرتی نہ ہوا تو پھبتیاں اڑیں گی"۔

"کہاں ہے؟" بڑے صاحب نے پوچھا،

"گھر میں ہے صاحب جی، میں بہانہ کر کے آئی ہوں۔ میں نے کہا میں ذرا جنگلی ساگ توڑ لاؤں، بولا، میں توڑے لاتا ہوں، میں نے کہا چوپال میں جانے سے شرم آتی ہے تو دوسروں کے کھیتوں کی مینڈوں پر سے ساگ توڑنے سے کیا طرہ اونچا ہو گا تیرا؟ جھینپ کر گنگنانے لگا — پھُل ہئی چندی آں یار چنبے دی بوُٹی آ —"

"بڑی رنگین بڑھیا ہے"۔ بڑے صاحب نے چھوٹے صاحب سے کہا۔

سب چھوٹے بڑے صاحبوں نے زور کے قہقہے لگائے اور بڑھیا ناک کو دوپٹے میں چھپا کر مسکرانے لگی اور بولی "ایسی ایسی کلیاں گاتا ہے کہ گھی ٹپکا پڑتا ہے ان سے!"

وہ سب ایک بار پھر زور سے ہنسے،

"تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے گھر جا کر تمہارے بیٹے کو بھرتی کر لائیں؟" بڑے صاحب نے نرمی سے پوچھا۔

"بڑا شرمیلا ہے صاحب جی" عورت نے منت کے انداز میں کہا "یہ پاس ہی تو میرا گھروندہ ہے، آپ چند قدم چلیں گے اور مجھ مسکین کا بھلا ہو جائے گا۔

بیٹا جیتا رہا تو الاؤنس ملے گا، مر گیا تو پنشن بندھ جائے گی، ہر حالت میں روپیہ تو کہیں گیا نہیں اور صاحب جی، مجھے تو گھن لگے چنوں نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ میری عمر کی عورتیں آج بھی گھوڑیوں کی طرح دوڑتی پھرتی ہیں، سر پر دودھ گھڑے اور بغل میں بچے ——— اور میں ہوں کہ آپ کو پکارنے کے لئے ذرا تیز تیز قدم اُٹھائے تو اب تک سانس سلیقے سے نہیں آرہی، پہلے تو آپ سب میرے سامنے پھرکیوں کی طرح گھومتے رہے۔"

بڑے صاحب عورت کی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے، بولے "اور کہیں اس وقت ہم تمہارے سامنے سر کے بل تو نہیں کھڑے ہیں؟"

عورت بے اختیار ہنس دی "سر کے بل ہوں آپ کے دشمن، جرمن اور جاپان، ——— واہ!" ——— اور وہ اپنے گھر کی طرف کچھ ایسے اعتماد سے پلٹی جیسے اب بھرتی والوں کے لئے انکار کرنا مشکل ہو گیا ہے،

اور وہ سچ مچ اس کے ساتھ ہو لئے۔

چند قدم چل کر عورت رُکی اور پھر بڑے صاحب کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عاجزی سے بولی "اتنا سا تھا جب اس کا باپ اللہ کے ہاں سدھارا، سات روپے مہینے کی پنشن تھی، اللہ کا دیا سب کچھ تھا، پہلی لام میں گھٹنے پر گولی لگی تھی اس لئے ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا مگر ناک نقشہ ایسا کہ آج بھی زندہ ہوتا تو آپ سمجھتے کوئی بھرتی ہونے آیا ہے، اس کا بیٹا ہوبہو وہی ہے، جمال بیگ نام ہے، میں اسے جموں اور جمالو اور بیگا ——— اور جانے کیا کیا کہتی ہوں، بڑا پیارا لگتا ہے مجھے، اکلوتا ہے نا، چکی پیس پیس کر اسے پالا پوسا اور چوتھی تک پڑھایا ہے۔ مجھے کہانیوں کی کتابیں

پڑھ کر سُناتا ہے اور گاتا اتنا اچھا ہے جیسے تانبے کے تھال میں بوندیں گر رہی ہوں۔"

بڑے صاحب نے اس کی بات کاٹی "تم نے تانبے کے تھال میں بوندوں کو گرتے سُنا ہے کبھی؟"

"لیجیے"۔ بڑھیا نے اپنے ہاتھ کو کمان بنا کر صاحب کی طرف اس طرح بڑھایا جیسے اس کا مذاق اُڑا رہی ہے۔" ارے صاحب، عمر گذر گئی تانبے کے تھال کی گنگناہٹ سنتے سنتے، زندگی میں مجھے کوئی ایسی برسات یاد نہیں جب ہمارے کوٹھے کی چھت نہ ٹپکی ہو، اور جہاں جہاں سے ٹپکا لگا میں نے اس کے نیچے تانبے کے تھال اور تھالیاں اور کٹورے رکھے، اور ہر بوند پر میرا جمالو ہاہاہا ہو ہو ہو پکار اُٹھا، ہم ماں بیٹا کونے میں دبکے یہ ساز سنتے تھے اور جمالو کہتا۔ ابھی اسی برسات میں کہہ رہا تھا کہ لوگ بوندوں کو دیکھتے ہیں اور ہم ماں بیٹا بوندوں کو سنتے ہیں۔"

چھوٹے صاحب سے بھی چھوٹے صاحب نے سگرٹ کا ٹرّا پوروں پر چڑھا کر دور پھینکتے ہوئے کہا "اب تمہارا گھر کتنی دُور ہے بڑھیا؟"

"بڑھیا!" عورت بے اختیار ہنسی! "ارے صاحب آپ نے شاید اب تک کوئی بڑھیا دیکھی نہیں چالیس کی بھی تو نہیں ہوں — بس اس موڑ سے اگلے موڑ پر میرا گھر ہے اور —" اب وہ بڑے صاحب سے مخاطب ہوئی۔ "ایسا گبرو آپ نے اب تک بھرتی نہیں کیا ہوگا صاحب جی، آپ ملک پنجاب کے پچھم سے پورب تک چلے جائیں، آپ کو ایسا جوان ذرا مشکل ہی سے ملے گا، صبح کی نئی نئی دھوپ کا سا تو رنگ ہے اس کا، اور بال ریشم جیسے، اور آنکھیں

اتنی پیاری جیسے خدا نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے بنائی ہیں، ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں، ہونٹ پر سنہرے سنہرے روئیں، جو دیکھنا چاہو تو نظر نہ آئیں اور ویسے یونہی سونے کی ایک لکیر جھلملا کر رہ جائے، چھاتی اس کی زمین بالشتوں کے برابر اور بازو یہ یہ، کبڈی کا کھلاڑی بھی ہے۔"

"تو وہ اتنا شرماتا کیوں ہے؟" صاحب نے پوچھا۔

"وہ سب سے شرماتا ہے صاحب جی۔ ساری دُنیا اس سے شرماتی ہے نا اس لئے وہ دُنیا کو دیکھ کر شرما جاتا ہے، کبڈی میں مقابل کے آدمی کو گرا کر پھر خود ہی اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیتا ہے اور سب سے بڑی مزے کی بات یہ ہے کہ مجال ہے جو کسی لڑکی کی طرف بُری نظر سے دیکھا ہو آج تک، ہر مرد نے زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی لڑکی کو ضرور بُری نظر سے دیکھا ہوگا، مگر وہ ہے کہ اِدھر سے کوئی لڑکی گذری اُدھر اس کے مُنہ پر گلاب کے پھول کھلے جا رہے ہیں۔"

بڑے صاحب نے چھوٹے صاحب سے پوچھا۔ "آپ نے کبھی کسی کو بُری نظر سے دیکھا ہے؟"

"جی" چھوٹے صاحب نے بڑے غرور سے اعتراف کیا۔

"کسے؟" بڑے صاحب شرارت پر تلے ہوئے تھے،

"اپنی بیوی کو" چھوٹے صاحب نے کہا۔ اور پھر ایک دم سب بے اختیار ہنس دیئے۔

عورت نے اپنی بات جاری رکھنے کے لئے ہونٹ کھولے تو چھوٹے صاحب نے بڑے صاحب سے پوچھا، "اور آپ نے؟"

بڑے صاحب بولے۔ "ہاں، ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ مگر وہ کسی اور لڑکے

کو بُری نظر سے دیکھ چکی تھی اس لئے بات آگے نہیں بڑھنے پائی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟" بڑے صاحب بولے "بس پھر ادھر ہٹلر نے سرکار کے خلاف جنگ کر دی اور ہم فوج میں بھرتی ہو گئے۔"

ایک بار پھر سب زور زور سے ہنسنے لگے،

چھوٹے سے بھی چھوٹے صاحب نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا "بھئی کہاں گیا تمہارا گھر؟"

"سامنے ہی تو ہے صاحب جی"۔ عورت بولی۔ اور پلٹ کر گاؤں کے ان لوگوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی جو پیچھے پیچھے دبے پاؤں آ رہے تھے، وہ سب حیران تھے اور اُن کے چہروں پر کچھ ایسا تاثر تھا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر جرأت نہیں کر پاتے،

عورت کہہ رہی تھی "میں نے اس کے لئے ایک لڑکی بھی ڈھونڈ نکالی ہے، اس کا باپ جنگل سے لکڑیاں کاٹتا ہے اور روز اٹھنّی کما لیتا ہے، لڑکی کھجور کے پتّوں کی چنگیریں بناتی ہے، ایسی پیاری پیاری کہ سُنا ہے اس کی بنی ہوئی چھ چنگیریں تو ہمارے تھانہ کا تھانے دار بھی لے گیا تھا اپنے کپتان کے لئے، سوچتی ہوں جموں بھرتی ہو جائے۔ کچھ الاؤنس آنے لگے تو چند زیور بنوا لوں، اور پھر جنگ رُکے تو شادی رچاؤں اس کی، سہرے گاؤں، ناچوں اور اتنی مہندی لگاؤں ہاتھوں پیروں میں کہ سُرخی مر کر بھی نہ مٹے۔"

اچانک چھوٹے صاحب نے بڑے صاحب کے کان میں سرگوشی کی اور بڑے

صاحب بھڑک کر بولے :" صاف بکواس ہے، کون کہتا ہے ؟ کوئی دشمن ہو گا اس کا، یہ دیہاتی لوگ بڑے کمینے ہوتے ہیں، ذرا ذرا سی دشمنیوں کے مارے لوگوں کی روزی پر ڈاکا ڈالنے سے نہیں چوکتے، آپ نے بھی اس کی باتیں سُنی ہیں، میں بھی سن رہا ہوں، اگر گڑبڑ کا شائبہ تک ہوتا تو وہیں سے لُڑھا دیتے، لاحول ولاقوۃ آپ سکول ماسٹر کے سکول ماسٹر ہی رہے۔"

عورت جو اب چند قدم آگے بڑھ گئی تھی، بولی :" یہ ہے میرا گھر وندہ صاحب جی۔" پھر وہ پلٹ کر بڑے صاحب کے پاس آئی اور لجاجت سے بولی :" اسے ضرور بھرتی کر کے اپنے ساتھ لے جائیے صاحب جی، مجھ سے گھن لگے چنے نہیں کھائے جاتے۔ گھی کھانے کا سن ہو اور دھول پھانکنے کو ملے تو آپ ہی کہئے، بیٹے کو لام پر نہیں بھیجوں گی تو کیا اپنے سینے پر سوار رکھوں گی! اور صاحب جی، وہ گبرو تو اس بلا کا ہے کہ اسے دیکھتے ہی اللہ کی قدرت یاد آ جاتی ہے، آپ کے تو چھکے چھوٹ جائیں گے — آئیے۔"

پھر وہ گھر کے دروازے پر آ کر پوری قوت کے ساتھ پکاری :" جموں — اے جالو، اے میرے سپاہی بیٹے!"

گاؤں والے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، بھرتی کرنیوالی ٹولی نے دروازے پر ٹکٹکی باندھ رکھی تھی، عورت کچھ دیر تک سب کے چہروں کو بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر ایکا ایکی وہ زور زور کے قہقہے لگا کر تالیاں بجانے لگی، اسکا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ سر کی چادر سرک کر نیچے گر گئی، اُلجھے ہوئے بال بے ترتیبی سے لٹکنے لگے اور وہ بڑے صاحب کی ناک کے پاس چٹکیاں بجاتے ہوئے وحشیانہ قہقہوں کے درمیان چیخ کی حد تک بولی :" سبحان اللہ! بھرتی کرنے چلے ہیں! — ارے جالو میرا لال تو ایک مہینہ ہوا رنگروٹ میں مارا جا چکا ہے!"

ووٹ

بھئی عجیب مشکل کا سامنا ہے، بھینس کے آگے بین بجانے والے تو خیر کوئی بزرگ گزرے ہی ہیں، اور خود میں نے پچھلے الیکشن میں کتنی بار بین بجائی۔ مگر مجھے اب کے بین بجانے کے علاوہ بھینس سے اس کی داد بھی لینا ہے، حلقے کے پچاس فی صدی ووٹ ملک صاحب کی جھولی میں ڈال چکا ہوں مگر وہ ہیں کہ بقیہ پچاس فی صدی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بچوں کی طرح مچل مچل جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مقابل کے امیدوار کی ضمانت ضبط نہ ہوئی تو ایسی کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی لعنت! بقیہ پچاس فیصدی کے لئے میں مزدور ہاتھ پیر مارتا، آخر آبائی پیشہ ہے، اور ووٹ حاصل کرنا بھی ایک فن ہے، مگر ان بقیہ پچاس فیصدی ووٹوں کی اکثریت اُن چھوٹے چھوٹے کسانوں اور مزارعوں کے پاس ہے۔ جو پچھلے دنوں کسان کمیٹی کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ملک صاحب پر چڑھ دوڑے تھے، ایسا ہلّہ بولا تھا، وہ وہ نعرے لگائے

تھے۔ وہ وہ گھونسے تانے تھے کہ بس اللہ دے اور بندہ لے، میں نے تو گولی چلانے کا مشورہ دے دیا تھا مگر ملک صاحب نے باوجود شدید رعشے کے ہمت کی، پیر جی کو بلوایا اور ان کے ساتھ ہجوم کے سامنے چلے آئے، اور یہ کنگلے ایسے طوطا چشم کہ ملک صاحب تو رہے ایک طرف، پیر جی کے لتے لے ڈالے، وہ تو کسان کمیٹی کا بھلا ہو کہ پروگرام پُر امن مظاہرے کا تھا ورنہ جانے کیا کچھ دیکھنا پڑتا۔ کسان اور مزارعے چلے گئے تو ملک صاحب نے گاؤں بھر کے مولویوں کو بلا کر ایک گھنٹے میں قرآن شریف کا ختم پڑھوا ڈالا۔ اور اس کے بعد ایسا حلوہ کھلایا کہ گھی کہنیوں تک دوڑ گیا، اور اب باقی ووٹ حاصل کرنے کے لئے مجھے انہیں "ہالیوں" کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ میں باز آیا اس دلالی سے، ملک صاحب نے اپنے اردگرد جو اتنے بہت سے کالے خانی مسٹنڈوں کی فصل اگا رکھی ہے، تو اسے کیوں نہیں کام میں لاتے، وہ آخر کس مرض کی دوا ہیں، بٹیر اور تیتر لڑائیں وہ، اور شیر کی مونچھ کا بال توڑوں میں! کیوں صاحب! آخر کیوں!——

اور پھر یہ ننگ دھڑنگ کنگلے قلاش جنم جنم کے بھک منگے، ان سے کوئی پوچھے کہ کیا یہ تمہارے باوا کی جاگیر ہے کہ نہ بٹائی دو نہ نذرانے، نہ بیگار پر کام کرو نہ ووٹ دو، بس پڑے اینڈتے رہو ان کھیتوں میں جن کے دانے دانے پر پٹوار خانے کی مہریں لگی ہیں، تم کیا جانو بدنصیبو کہ یہ زمینیں کہاں سے آئی ہیں، شاہجہان کے زمانے میں ملک صاحب کے ایک بزرگ سنگِ مرمر کی قبریں بناتے تھے، شاہجہان کی ایک باندی کی قبر کے صلے میں انہیں ایک سو ایکڑ زمین ملی، پھر بڑی جاگیریں تو خرگوشوں طرح پھولتی پھلتی ہیں، ہر نسل نے

سو دو سو ایکڑ کا اضافہ کیا، سکھوں کے زمانے میں ملک جی کے پرداوا نے ایک گوردوارے کے لئے ایک سو ایکڑ زمین دے دی اور مہاراجہ نے خوش ہو کر بدلے میں پانچ سو ایکڑ کی جاگیر بخش دی۔ انگریز کے زمانے میں اِس پرداوا نے علاقے کے پانچ سو جوان دلّی کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجے، جن میں سے صرف کالے خاں اور اس کے چند ساتھی واپس آسکے، انگریز نے خوش ہو کر پانچ گاؤں ملک جی کے سپرد کر دیئے، یعنی ایک سو جوان کے بدلے میں ایک گاؤں، انگریز سرکار کی فراخ دِلی تو خیر کہاوت بن چکی ہے۔ اور ہاں، وہ جو کالے خان اور اس کے ساتھی غدر سے واپس آئے تھے، تو اُن سورماؤں نے جلّادوں کا فرض سنبھال لیا، کہتے ہیں ان کے ہاتھوں میں تیل میں سنے ہوئے چابک ہوتے تھے اور جب کوئی کسان ذرا سا اکڑتا تھا تو یہ چابک سڑاسڑ چلتے تھے، اور اس کی جلد کی کترنیں تک گرنے لگتی تھیں۔ پھر ٹوانہ راج میں ملک صاحب نے مسلم لیگ میں کام کرنے والوں پر وہ وہ جھوٹے مقدمے چلوائے کہ ہائی کورٹ تک اپیلیں نامنظور ہوتی چلی گئی تھیں، چند کسانوں نے جناح صاحب کا نام لیا تو ملک صاحب نے انہیں چوپال کے ستونوں سے باندھ کر کالے خانیوں کو بلوایا، انہوں نے مرچوں کا دھواں دیا تو لیگ کے سارے نشے ہرن ہو گئے، پھر پاکستان بننے کے بعد ملک صاحب کے بنگلے پر اتنا اونچا جھنڈا نصب کیا گیا کہ کووں، چیلوں، اور چڑیوں نے کچھ دن کے لئے ادھر آنا تک چھوڑ دیا تھا، اور آج ملک صاحب پاکستان کے بہت بڑے خیرخواہوں میں گنے جاتے ہیں، اور حکمرانوں کے نمائندے اس علاقے میں آئیں تو سب سے پہلے ملک صاحب ہی کے ہاں دعوت کھاتے

ہیں، اور یوں ان کی زمینیں مزید انڈے دے رہی ہیں ۔۔ صوبے کی لیگ کے جلسوں میں ہوا کا رُخ دیکھنا ہو تو ملک صاحب کو دیکھ لو، جدھر وہ ہوں گے اُدھر ایک دُنیا ہوگی ۔ تو مطلب یہ ہے ان ساری باتوں کا کہ ملک صاحب کا بڑا اقبال ہے، کبھی کبھار مسجد میں آنکلیں تو نمازی مارے ادب کے اگلی صف چھوڑ کر پیچھے ہٹ آتے ہیں اور امام صاحب اپنی جائے نماز اُٹھا کر ان کے سامنے بچھا دیتے ہیں، نہ جانے ان کسانوں اور مزارعوں کو کسان کمیٹی والوں نے کون سا تعویذ گھول کر پلا دیا ہے کہ یہ نمک حرام اب انہی ملک صاحب کے منہ آنے لگے ہیں۔ اور ادھر ملک صاحب کے اوسان بھی خطا ہو رہے ہیں، راتوں کو اُٹھ اُٹھ بیٹھتے ہیں اور تکیئے کے نیچے ریوالور ٹٹول ٹٹول کر آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں گھورتے رہ جاتے ہیں، میں ایک رات اس وقت جاگ رہا تھا جب ملک صاحب ہڑبڑا کر اُٹھے اور ریوالور سنبھال لیا، میں نے چونک کر پوچھا "کیا بات ہے؟" ۔۔ تو انہوں نے نہ جانے کیوں جواب میں مجھے گالی دے دی، صبح کو اٹھے تو میرے پراٹھے پر مکھن کا ایک گولا رکھتے ہوئے بولے "برا نہ ماننا بھئی ہدایت اللہ میں گالی تمہیں نہیں دی تھی"۔

میں نے ویسے ہی بات چلانے کے لئے پوچھ لیا "تو پھر کسے دی تھی؟"۔

اور وہ مکھن کو پراٹھے پر پٹخ کر غصے سے بولے "تمہاری ماں کو دی تھی"۔

یعنی مطلب یہ ہوا ان باتوں کا کہ ملک صاحب کا اپنا تو یہ حال ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں ان کسانوں سے ووٹ مانگنے جاؤں، کوئی دے دے تو ذرا سا تھپک دوں، انکار کرے تو زمین سے بے دخل کردوں اسے اور کوئی بے دخل بھی

نہ ہو تو اس کے گھر میں کوئی ٹوٹا پھوٹا گھسا گھسایا پستول پھینکوا کر تھانیدار کو اطلاع دے دوں اور خود ایک طرف بیٹھ کر تماشہ دیکھوں، راج ہٹ دیکھئے کہ کہتے ہیں مقابل کے امیدوار کو ایک بھی ووٹ نہ ملے۔ سن پینتالیس کے الکشن میں تو خیر سب ڈویژنل افسر نے ان کے حق میں ہاتھ کی صفائی کا ایک ایسا کمال دکھایا تھا کہ الکشنوں کے بڑے بڑے گھاگ ان کے ہاتھ چومنے کو تیار ہو گئے تھے اور ووٹر ان کے نام کا کلمہ پڑھنے لگے تھے، ووٹ اُدھر دیتے تھے اور وہ اِدھر چلا آتا تھا، اب ایسا دولھا قسم کا سب ڈویژنل افسر کہاں سے آئے۔ ملک صاحب کی صاحب سلامت تو ہر افسر سے آج بھی ہے مگر راتوں کو اکٹھے ہو کر خاص الخاص گانے والیوں پر روپے نچھاور کرنے اور خود نچھاور ہو جانے والے افسر اب کہاں! ہوں گے تو ضرور پر اِدھر تو صرف سوکھے سڑے آنکلتے ہیں جنہیں مسلوں کا کیڑا چاٹ چکا ہے۔ سبحان اللہ کیا زمانے تھے، سب ڈویژنل افسری طاق پر دھری ہے۔ اور حضرت آدم کے سیدھے سادھے بیٹے سامنے آ گئے ہیں۔ ننگے ہو ہو کر گانے والیوں کے اردگرد ناچ رہے ہیں، اور گانے والیوں کو ننگا کر کے اپنے اردگرد نچا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں اب تک بوڑھا نہیں ہوا، ایک بار مونچھ کا ایک بال سفید ہو رہا تھا کہ اتفاق سے سب ڈویژنل افسر کے دورے کا پروگرام آ گیا، اور ملک صاحب نے رقص و سرود کا پروگرام مرتب کیا، ملتان سے چار "دانے" منگوائے گئے اور جب سب کچھ ہو ہوا چکا، یعنی جب سب پروگرام پورے ہو گئے تو سفید بال غائب ہو چکا تھا۔ ہائے کیا دن تھے اور کیا لوگ تھے، سردیوں میں اگر کسی افسر کا دورہ پڑتا تو کسان اور مزارعے مرغیوں اور اُن کے انڈوں اور پھر لکڑیوں اور گھی تک کا ایک انبار

لگا جاتے، حقے دھوتے، چلمیں جماتے، اور چوپال کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر گانے گاتے، ملک صاحب کی ماں مری تھی تو جوق در جوق ہر طرف سے امڈ پڑے تھے، اور ان کی عورتوں نے جنازے پر اس شان سے پیٹا تھا کہ آج تک کسی جاگیردار کی ماں کو شائد ہی ایسا ماتم نصیب ہؤا ہو، اور اب یہی کسان ہیں کہ بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں، ادھر ایک ہاتھ اٹھاؤ تو ادھر پچاس درانتیاں ابھرتی ہیں، اور مجھے ان گنواروں کے پاس ووٹ لینے کے لئے بھیجا جا رہا ہے، اور اگر میں ان سے ووٹ نہ لے سکا تو دلالی کی فیس کا نصف حصہ کٹ جائے گا اور عمر بھر کی شاندار دلالی پر پانی الگ پھر جائے گا، سیدھی سی بات تھی، پولنگ کی تاریخ کا انتظار کرتے، اور پولنگ افسر کو بیس تیس چالیس ہزار تھما دیتے تو نہ ملک صاحب کی نیندیں حرام ہوتیں نہ مجھے اس دوزخ میں دھکا دیا جاتا، مگر ایک عرصے سے ملک صاحب کو روپیہ کچھ ایسا پیارا لگنے لگا ہے۔ کہ جیب سے ایک چھلکا نکالتے ہیں تو اختلاج شروع ہو جاتا ہے اگندم کے نرخ میں ساڑھے تین آنے فی من کی کمی ہوئی تو وہ تہجد پڑھتے ہیں، وہ نفل ادا کئے ہیں کہ نرخ گرا رہتا تو اب تک قطب بن چکے ہوتے ۔،

بہر حال جانا تو ہے ہی، رخصت ہولوں ملک صاحب سے، ہو سکتا ہے انہیں رحم آ جائے اور اپنے عبدالغفور ہی کو بھیج دیں۔ یا مجھے ہی ان کمبختوں کو درغلانے کا کوئی آسان سا گر بتا دیں ـ مگر کیا بتا پائیں گے، میں نے تو سنا ہے بزرگوں سے کہ فصل میں ڈوبی ہوئی درانتی جب کسان کے کندھے سے اوپر اٹھ کر تل جائے گی اور تلی ہی رہے گی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت اسرائیل اپنے صور کو پھونکنے ہی

والے ہیں"۔

(۲)

"تم بھی عجیب ہونق قسم کے آدمی ہو ہدائت اللہ، ولالوں کے یہ چلن نہیں ہوتے کہ ووٹروں سے سریشں کی طرح چمٹ جانے کے بجائے ان سے کترانے کے ڈھنگ سوچتے پھرو، باپ دادا کے نام کو بٹہ لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ وہ تمہارے دادا ہی تو تھے جنہوں نے میرے بہشتی دادا کے دشمنوں کے لئے ایسے ایسے سستے کرائے کے قاتل ڈھونڈ نکالے تھے جیسے وہ لوگ انسان کی جگہ گاجریں مولیاں کاٹنے نکلتے ہیں، پچاس روپے اور تن کے تین کپڑے بھی کوئی قیمت ہے ایک انسان کی؟ اور وہ بھی دشمن انسان کی؟ اور پھر تمہارے باپ نے میرے ابا جان مرحوم و مغفور کے لئے ایسی ایسی بیویوں کے سودے کئے کہ جہاں بیٹھتی تھیں وہاں گزوں تک مٹی کے ذرّے تک چمک اٹھتے تھے، اور تعداد کو شرعی تعداد سے بڑھتے دیکھا تو فالتو بیویوں کی موت کے ایسے ایسے ٹوٹکے سجھائے کہ کوئی بھولے سے بھی قتل کا شبہ نہیں کر سکتا تھا، اور ایک تم بھلے مانس ہو کہ کسان کمیٹی والوں کے خوف سے تمہاری گھگھی بندھی جا رہی ہے، ناک میں بلاق اور کانوں میں بالیاں پہن کر باہر گلیوں میں تالیاں بجاتے اور گاتے ہوئے نکل جاؤ — شرم تو نہیں آتی؟"

"جی آ رہی ہے"، میں جواب دیتا ہوں۔ اور میں جھوٹ نہیں بول رہا، سچ مچ مجھے شرم آ رہی ہے، باپ دادا کے لئے کرائے پر مجھ سے تو پانی نہیں بھرے گا، امیر وزیر اور جن بھوت کا خوف تو خیر سمجھ میں آنے والی چیز ہے، مگر کسانوں مزدوروں

کے خوف کا مطلب! لاحول ولا قوۃ ——

"ملک جی بات یہ ہے کہ پندرہ بیس بدمعاش میرے ساتھ کر دیجئے۔ پھر دیکھئے دلالی کے کیسے سینہ بہ سینہ آئے ہوئے نسخے آزماتا ہوں ان پر، ووٹ نہیں ملیں گے تو لڑکیاں اٹھوا لوں گا، لڑکیاں نہ اٹھ سکیں تو قتل کر دوں گا، زہر دے دوں گا، کہوں گا ہیضہ لے گیا ہے سب کو۔ آپ کے پاس تو حضور، میاں کالے خاں کی اولاد بھری پڑی ہے، بڑے بھارو بریڈ قسم کے بدمعاش ہیں، بس انہیں میری کمان میں دے دیجئے، پھر دیکھئے کیسے ناکوں چنے چبواتا ہوں۔ اور کچھ نہیں ہو گا تو زمینوں پر تو ان کے باوا کا اجارہ نہیں، کھڑے کھڑے نکلوا دوں گا۔ پھر جب پیٹ میں چوہوں کی بھگدڑ مچے گی تو دو اور دو چار کی بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی، —— لیکن ملک جی آپ کچھ روپیہ بھی میرے ساتھ کر دیتے تو بہتر رہتا، قسم کھاتا ہوں آپ کی دستار کی کہ ایک پائی بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو گی، روپیہ اور رائفل، یہی تو مشکل کشا ہیں اس زمانے کے۔"

"روپیہ؟" ملک صاحب حقے کی نے پر ایک ٹوٹے ہوئے تار کا سرا پکڑ کر مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے بہت بڑی گالی دینا چاہتے ہیں مگر فیصلہ نہیں کر پاتے، پھر وہ ایک زور کا کش لگا کر دھوئیں کو نتھنوں کے راستے اپنے گل مچھوں میں چھوڑتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ہاتھ کے میل کی میں نے پہلے کبھی پروا کی ہے۔ جو آج کروں گا، مگر بھئی ہدایت اللہ، اب کے سرکار نے اعلان کر دیا ہے کہ الکشن میں روپیہ استعمال نہ ہو، ہم اگر ایسا کر بیٹھے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اور مجھے اسمبلی میں جانا ہے، سمجھے؟ یہ نمبرداری سفید پوشی کا جھگڑا نہیں، اور میں نے

اپنی ذیلداری کے تنازعے میں بھی تمہیں یاد ہو گا فنانشل کمشنر بہادر کو دو دو ہزار کی دو دعوتیں دی تھیں اور دشمن کے تین رشتہ دار قتل کروا ڈالے تھے، ہیں روپے پیسے کو تو اپنی جوتی کی نوک تک پر نہیں لکھتا، مگر دیکھو، اب کے روپیہ خرچ نہیں ہو گا، انگریز ہوتا تو اس کے حکم کی خلاف ورزی میں مزا آتا۔ اپنے ہی بھائی بندوں کا راج ہے —— ہم سے یہ سؤر نہیں کھایا جائے گا، سمجھے؟ رہی بدمعاشوں کی ٹولی، تو تین چار تم لیتے جاؤ، باقی یہیں رہیں گے، جن کسانوں نے وعدے کر رکھے ہیں ان کی نگرانی بھی تو ضروری ہے، سنا ہے وہ حرامزادہ حشمت خاں کہہ رہا ہے کہ پچھلے تین چار برس میں ملک نے کون سا تیر مارا ہے جو اب بھی اپنا ووٹ ضائع کروں، جیسے ہم اسمبلی میں تیر مارنے ہی تو جاتے ہیں! کالے خانیوں نے اس کے تین چار بیلوں کو زہر دے دیا اور دو چار بیٹوں بیٹیوں کی راہ چلتے مٹی چاپی کر دی تو بسم اللہ کر کے ووٹ مجھی کو دے گا سالا، سو اس کام کے لئے باقی کالے خانیئے میرے پاس رہنے دو، حمزے کو تم لے جاؤ، لیکن اسے اور اس کے ساتھیوں کو کسان کمیٹی کے ان مریدوں کے بارے میں سمجھا دینا، کہیں شکاری خود ہی شکار نہ ہو جائیں، پہلے شرافت سے بات کرو، منتیں کرو، پگڑی اتار کر ان کے جوتوں پر رکھ دو، ان کے بچوں میں مخانے بانٹو، چلو یہ بھی کہہ دو کہ اب کے ملک صاحب اسمبلی میں زمینداری کو بلا معاوضہ ختم کرنے کی کوشش کریں گے، اور اپنی زمینیں اپنے مزارعوں میں بانٹ کر صرف ممبر رہ جائیں گے اسمبلی کے، ویسے بھی میرا ارادہ ہے کہ اب زندگی کے جو چند برس باقی ہیں انہیں خدا کی یاد میں گزار دوں، —— سو ان پر کچھ اس طرح کا مسکا لگاؤ، اوہاں —— خیر تھوڑا سا روپیہ بھی لیتے جاؤ'

دس ہزار کے قریب ووٹ ہیں۔ پانچہزار لے جاؤ، مگر یہ روپیہ یوں بانٹو جیسے تم ووٹ نہیں مانگ رہے، یتیم خانے میں چندہ دے رہے ہو، سمجھے؟ اور اگر یہ سارے جادو نہ چل سکیں تو پھر جو بھی جی میں آئے کر گزرو، اللہ تعالیٰ سب کے پردے رکھتا ہے، تمہارا بال تک بیکا نہ ہو گا، اور ہاں ایک ضروری بات تو بھولے ہی جا رہا تھا۔ یہ کالے خانئے کمبخت، لڑکیوں کے بڑے شوقین ہیں، اگر معاملہ کسانوں کی بہو بیٹیوں کی پکڑ دھکڑ تک پہنچے تو مجھے پیغام بھجوانا۔ یہ سالے سچے موتیوں کو خاک میں رول دیتے ہیں۔ پھول توڑ لینا اور بات ہے اور پھول کو سنبھالنا دوسری بات ہے، تو خیر۔ اب تم جاؤ، پانچہزار منشی سے لے لو، میں حمزے کو بلوا رہا ہوں، چند ہتھیار بھی اس کے ساتھ کر دوں گا، مگر دیکھو روپے اور ہتھیار کی بات کسی کو معلوم نہ ہونے پائے، میرے منہ پر جو ناک ہے، وہ صرف میری ناک نہیں، تمہارے اپنے باپ دادا کی ناک ہے، سن رہے ہو نا؟ خدا حافظ۔"

میں ہاتھ جوڑ کر آخری درخواست کرتا ہوں۔ "مگر سرکار، کیا ان پاگل کسانوں کی طرف صرف مجھی کو بھیجا جائے گا؟ عبدالغفور کو بھیج دیجئے، اسے بھی تو دعویٰ ہے کہ پانچ منٹ میں وہ بڑے سے بڑے کافر کو مسلمان بنا سکتا ہے۔ اس دن چوپال پر کہہ رہا تھا کہ ووٹ ہدایت اللہ کو نہیں ملے، ملک صاحب کے اقبال کو ملے ہیں، آپ کا اقبال آپ کے دلالوں کا بڑا سہارا ہے۔ مگر ملک صاحب گستاخی معاف، انصاف شرط ہے، ایک زمانہ تھا کہ لوگ آپ کا نام سنکر کانپ جاتے تھے۔ اب بحث کرتے ہیں، اور اس کے باوجود حلقے کے آدھے ووٹروں کو آپ کے خادم نے ہموار کیا ہے۔ آپ ذرا عبدالغفور کو بھی کسوٹی پر لگا دیکھئے۔"

ملک صاحب اُٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیتے ہیں۔" عبدالغفور دوست مزدور ہے مگر دلال نہیں۔ تم دوست بھی ہو اور دلال بھی، خدا کا نام لے کر سفر کی تیاری کرو، اور دیکھو، جانے سے پہلے مسجد میں ضرور ہو آنا۔ مولوی صاحب سے دعا لے لینا، اور اگر پانچ ہزار روپوں میں سے پہلا روپیہ تم مولوی جی کے ہاتھ پر رکھ دو۔ تو بسم اللہ اچھی رہے گی۔ جاؤ فی امان اللہ۔"

(۳)

میں ان بستیوں کے چپے چپے سے واقف ہوں، مجھے سر مونٹ مورمینسی صاحب بہادر کا زمانہ یاد آرہا ہے، جب حضور لاٹ صاحب یہیں ایک بار شکار کھیلنے کے لئے آئے۔ تازی کتوں کی ایک پلٹن ہمارے ساتھ تھی، سکھائے ہوئے باز ریشمی ٹوپیاں پہنے مراسیوں اور مصلیوں کے ہاتھوں پر پنجے جمائے بیٹھے تھے، گھوڑوں کی ایک قطار آگے آگے تھی اور میں حضور لاٹ صاحب کے گھوڑے کے بالکل پیچھے تھا، میں نے کتنی بار حضور کی رکاب تھامی کیونکہ ان دنوں وہ ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ انہیں بار بار اترنا پڑتا تھا، گورے رنگ پر ہلدی کھنڈ رہی تھی مگر مجال ہے جو لاٹ صاحبی کے ٹھاٹ پر حرف آنے دیں، ایسا لگتا تھا جیسے سارا پنجاب ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے بچھا ہوا ہے، اور پھر جب ایک بار ہرنوں کی ایک ڈار ہمیں نظر آئی ہے اور کتے لپکے اور گھوڑے جھپٹے ہیں تو حضور لاٹ صاحب کا گھوڑا ہم سب جنم جنم کے گھڑ سواروں سے آگے تھا۔ جھاڑیاں اور کھائیاں الانگتے ہوئے وہ ہرنوں پر بجلی بن کر ٹوٹے۔ دو کو حضور نے بھون ڈالا، ایک کو کتوں نے دبوچا اور ہرنی کا ایک بچہ تھک ہار کر ہمارے حلقے میں گھر گیا۔ اس ہرن بچے

پر جو حضور لاٹ صاحب نے شفقت سے ہاتھ پھیرا ہے اور اس کے کانوں کی جڑوں میں کھجلایا ہے، تو خداوند کریم کی قسم، یقین ہو گیا کہ اس انگریز قوم کو حکمرانی دے کر اللہ تعالیٰ نے سچ مچ انصاف فرمایا ہے، حیوانوں تک سے ایسا سلوک میں نے آج تک نہ دیکھا نہ سُنا، اور پھر آزادی کا یہ عالم کہ مجھ سے باتیں فرما رہے ہیں، یعنی مجھ سے، اپنے پیروں کی دھول سے مخاطب ہیں۔ بولے "ہڈ اینٹ اللہ، تم ملک صاحب کا پرانا کھڈمٹ گار ہے، کوئی بیٹا ہو تو بتاؤ، ہم پٹواری بھرتی کرے گا"——

اللہ اللہ! کیا زمانے تھے اور کیا انداز تھے، انگریز افسروں کے بوٹوں کی دو ایک بار گرد جھاڑ دو اور بیٹے کو پٹواری بھرتی کرا لو، تنخواہ بیس روپے اور اوپر سے سینکڑوں اللہ تعالیٰ کی برکت سے، —— اور پھر اس روز اپنے پیدل ساتھیوں کے انتظار میں حضور لاٹ صاحب نے انہی بستیوں کی سیر کی، جدھر سے گزرتے تھے ولایت آباد ہوتی جا رہی تھی، کسان خواہ مخواہ کانپے جا رہے تھے؛ حضور ایک جلاہے کی کھڈی تک ملاحظہ فرمانے چلے گئے، اور جلاہے کا یہ عالم کہ حضور سوت کے تار کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور جولاہا "جی مہربانی، جی آپ کا کتا ہوں"۔ کی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ کھانے کا وقت آیا تو ہر شکاری کے سامنے دو دو بھنے ہوئے سالم مرغے رکھے تھے، حضور نے ان بستی والوں سے خوش ہو کر مدرسے کے بچوں میں مٹھائی بانٹنے کے لئے اپنی جیب خاص سے دس روپے عنایت فرمائے؛

میں ان بستیوں میں ملک صاحب کے کارندے کی حیثیت سے بھی کئی بار آ چکا ہوں، پولیس کے ساتھ بھی یہاں کتنے چکر لگائے ہیں، ملک صاحب کے لئے

ایک بیوی بھی تو یہیں سے چنی تھی، جسے چار سال کے بعد مجبوراً زہر دے دینا پڑا، کمبخت ہر نو دس مہینے کے بعد اکٹھے دو دو بچے دیئے جا رہی تھی اور یہ آٹھوں کے آٹھوں بچے تندرست و توانا تھے، کالے خانیوں کی ایک عورت نے اُسے دوا کے بہانے زہر پلایا تو کہتے ہیں اتنی خوبصورت ہو گئی دم توڑنے کے بعد، کہ ملک جی خود کہتے ہیں اس کی لاش کو عمر بھر شیشے کی الماری میں سجائے رکھنے کو جی چاہتا تھا، خدا کے غضب سے ڈرتے تھے ورنہ شائد اسے الماری میں رکھ ہی لیتے، اور پھر انہی بستیوں میں میں نے منہ پھٹ کسانوں کو وہ وہ جوتے مارے ہیں، وہ وہ ٹھوکریں لگائی ہیں کہ جب لوگ اُنہیں میرے سامنے سے اُٹھا کر لے گئے تو ان کے کفن دفن تک کی تیاریاں کر ڈالیں۔ یہ کسان لوگ منہ پھٹ تو ازل ہی سے ہیں، اچھے خاصے پڑے خاک چاٹ رہے ہیں کہ دماغ میں کوئی کیڑا کلبلاتا ہے اور منہ نوچ لیتے ہیں، اس لئے تو ابا مرحوم کہا کرتے تھے کہ کسان اور کتے پر اعتبار نہ کرو، جو شخص اپنے پاس ہر وقت کسان کے لئے ٹھوکر اور کتے کے لئے لاٹھی نہیں رکھتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور رگیدا جائے گا، چمکارو گے تو پھٹکاریں گے، پھٹکارو گے تو دم ہلانے لگیں گے، اور ہمارے ملک جی بھی کچی گولیاں تو کھیلے نہیں۔ منہ پھٹ لوگوں کو چن چن کے نکالا ہے اور ایسا نکالا ہے کہ جہاں بھی گئے ہیں زمینداروں نے دھکا دے کر چلتا کیا ہے، کئی فاقوں ہی میں مر کھپ گئے۔ کئی کوئلے اور نمک کی کانوں میں چلے گئے، اور کئی بیوی بچوں سمیت بھک منگے بن گئے، لائل پور کے گھنٹہ گھر سے ٹیک لگائے آج بھی جو بھکاری ہر راہ چلتے پر دھڑا دھڑ تھوکتا رہتا ہے وہ ملک جی کا پرانا مزارعہ چراغ دین ہی تو ہے، جسے

ملک صاحب نے ایک بار یونہی رواروی میں ایک ذرا سی ماں کی گالی دے دی تو اس کمبخت نے چپل اتار کر ملک جی کے منہ پر دے مارا تھا اور ان پہ تھوک دیا تھا' حرامزادہ - سؤر کا بچہ '

اور اب انہی بستیوں میں جتنے بھی کسان ہیں اس بوڑھے چراغ دین سے بھی چار قدم آگے نکل گئے ہیں، سب کو چن چن کے نکال دیا جاتا مگر حرامزادوں کا ایکا ہے اور یہ ایکا ایسا پکا ہے کہ کسی کو نقب تک نہیں لگانے دیتے، اور ہمارے ملک صاحب میں اور کتنی خوبیاں کیوں نہ ہوں، ایک یہی کمی بہت کھٹکتی ہے کہ دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئے ہیں - اب دس ہزار ووٹوں کے لئے پانچ ہزار کی رقم کا مطلب تو یہ ہوا کہ اٹھنی اٹھنی میں ووٹ خریدنے چلے ہیں، اور اگر میں ان میں سے اپنا اور کالے خانیوں کا خرچ نکال لوں تو کوئی پانچ پانچ آنے فی ووٹ باقی رہ جاتے ہیں، ووٹ نہ ہوئے ریوڑیاں ہوگئیں کہ چونی دونی دو اور مٹھی بھر لو، الکشن لڑنے چلے ہیں، نمک حرامی ہوگی ورنہ کبھی کبھی تو انہیں گالی دینے کو جی چاہتا ہے، دلالی کی دنیا ہی بدل گئی ہماری ساکھ مٹ چلی ہے ان کے باپ کی کسان کمیٹیوں اور ان کی ماں کے جمہوری مورچوں کے ہاتھوں —— اور اب سامنے یہ بستیاں بکھری پڑی ہیں، ہر مکان ایسا لگتا ہے جیسے شیر کا پنجرہ ہے۔ اور اندر شیر اور شیرنیاں اور ان کے بچے کھڑے دھاڑ رہے ہیں ہم پر!

" حمزے بھائی ذرا میرے قریب آجاؤ، تمہاری دونوں ٹیلوں میں ریوالور میں اور ادھر میری جان پر بنی ہے، تم نے رات کے اندھیرے میں اکیلے دکیلوں کو آرام سے لٹا کر آہستہ سے ذبح کر ڈالا ہے، مگر یہاں دس ہزار کا معاملہ ہے اور پل کی

ہتھکڑیاں جکڑنے والے ہاتھ اگر ہماری گردنوں کی طرف بڑھے تو ہم یوں لٹکے رہ جائیں گے جیسے بلّی کے منہ میں چوہا ۔۔ مونچھوں پر اتنا تاؤ نہ دو، پگڑی کو ماتھے پر سے اُٹھالو، اور فی الحال بالکل شریف آدمی بن جاؤ، خبردار جو ان بستیوں میں کہیں آنکھ وانکھ ماردی، سُنا ہے آج کل تو کسان عورت بھی اپنی زبان کی جگہ درانتی کی زبان سے جواب دیتی ہے، عورت پنکھڑی سہی، لیکن بعض پنکھڑیاں زہر بھی تو ہوتی ہیں، ضروری نہیں کہ سب گلاب ہی کی نسل سے ہوں۔ آس پاس کے کھیتوں سے کسان ہل چھوڑ چھاڑ کر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ وہ سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں، ان کی طرف گھورو نہیں، اُن کے پاس پہنچتے ہی ان سے یوں ملو جیسے وہ تمہارے سگے چچا کے بیٹے ہیں۔

اور یہ جو پانچ ہزار ہیں نا میری جیب میں، یہ ہم پانچ ہی آپس میں بانٹ لیں گے، ان کسانوں پر روپیہ ضائع کرنا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شور زمین میں بیج بو دے، بہرحال نمک حلالی ہم سب کی گھٹی میں پڑی ہے، غدر کے زمانے سے ملک صاحب کے خاندان کا دیا کھا رہے ہیں، کوشش تو ضرور کریں گے۔ مگر منت سماجت اور مار دھاڑ سے یوں نہ مانے تو پانچ آنوں سے بھی نہیں مانیں گے۔

ذرا اور قریب آجاؤ، منشی کو تو اطلاع مل چکی ہوگی کہ ہم آ رہے ہیں، سُنا ہے منشی کی جان عذاب میں ہے، اس کی بیوی نے چار دفعہ اسے خودکشی کرنے سے بچایا ہے، خیر، جانے دو اِن باتوں کو۔ ایک دفعہ ذرا اسمبلی تک، چلے جائیں ہمارے ملک صاحب، پھر دیکھو کیسے اُجڑتی ہیں یہ بستیاں، ان کی جگہ مہاجر کسان بلائے جائیں گے، مگر سُنا ہے اب ان کے حوصلے بھی بڑھ رہے ہیں، اور

ایکا ہو رہا ہے ان میں، جانے اس ایکے کا توڑ کیا ہے، روپیہ اور رائفل تو بیکار ہو گئے، مجھے تو کبھی کبھی ایٹم بم کا خیال آنے لگتا ہے مگر خیر، ۔

"کسان ہمارے قریب آرہے ہیں، کسی کو آیۃ الکرسی یاد ہے تو پڑھ لو، کسی کو یاد نہیں مردودو؟ مجھے بھی تو یاد نہیں، ملک کی خدمت کی دھن میں اپنے خدا کو بھلائے بیٹھا ہوں اب خدا ہی لاج رکھے تو رکھے!

(۷)

ٹھیک کہتے ہو حمزے، ہم نے ان کسانوں کو راضی کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا، منت خوشامد کی، پگڑیاں اتار اتار کر ان کے قدموں میں ڈال دیں، ان کے غلیظ بچوں تک کو پیار کیا، پر انہوں نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ ہم ان کے آج ہی کے نہیں صدیوں کے دشمن ہیں، اور وہ صرف آج ہی کا نہیں صدیوں کا بدلہ ... ... چکانے نکلے ہیں، اور وہ یہ باتیں ملک صاحب کی زمینوں پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ان زمینوں کی اجڑی کوکھ کو انہی نے آباد کیا ہے۔ اس لئے زمینیں بھی اُنہی کی ہیں، کیا نرالی منطق ہے، پیار سے نہیں مانے تو تم نے ایک منہ پھٹ بڈھے کو گالی دے دی، ایک اتنی سی خشخاش کے دانے بھر کی تو گالی تھی مگر بڈھے پر کیا کیا رنگ آئے ہیں، اور اس کے ساتھی کیسے آپے سے باہر ہو ہو گئے ہیں، وہ تو بھلا ہو مولوی نجم الحسن کا کہ شور سن کر نماز توڑ دی اور قرآن شریف اُٹھا کر بھاگے آئے ورنہ میرے سامنے تو قبروں کی قطاریں گھوم گئی تھیں، اور پھر غضب یہ کہ وہ مولوی جی کے پیچھے بھی ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ باتیں سنی تھیں نا ان کی؟ کہتے تھے تمہارا خدا صرف

جاگیرداروں کا خدا کیوں ہے ؟ آسمان سے بجلی بھی نہیں ٹوٹتی کہ بھسم ہو جائیں سالے، گھٹنوں اور کہنیوں پر سے لباس اڑ گیا ہے۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ اور باتیں ؟ —— باتیں یہ کہ اب ہمارا وقت ہے، اور ہم تم سے اپنا حق مانگیں گے نہیں، چھین لیں گے، جھپٹ لیں گے ؟ —— جھپٹ لیں گے ؟ سنتے ہو ؟ —— سو حالات اس سے آگے کیا بڑھتے ؟ اس سے آگے تو فرشتوں کو بھی دمہ ہو جائے !

تم نے اچھا کیا کہ حلیمہ کو اُٹھا لائے ہو، میں نے بھی مجمع میں اسے دیکھا تھا تو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی نے میری آنکھیں نکال لی ہیں، روشنی ہی روشنی اور اندھیرا ہی اندھیرا، اسی لئے تو اس وقت میں نے پانی مانگا تھا — بالکل چکاچوند چھا گئی، اور جب سب ہمیں گالیاں دے رہے تھے تو اس کی گالی سنی تھی تم نے؟ میں تو اس کی گالی سنتا رہا۔ اتنی مٹھاس تھی اس کی آواز میں جیسے دعائیں دے رہی ہے، جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھوں پیروں کے علاوہ اس کے منہ پر بھی پٹی باندھی جائے مگر فی الحال بندھی رہے، ملک صاحب کے سامنے جا کر کھولیں گے، جڑاؤ پلنگ پر لیٹے گی تو زبان خود بخود گنگ ہو جائے گی، مصری سے کہہ دیا ہے نا کہ فی الحال زبردستی نہ کرے، اس کا پھٹا ہوا چولا بھی کسی طرح سل جاتا تو اچھا تھا۔ اس کی سنہری جلد کالے چولے میں سے جھلکتی ہے تو خواہ مخواہ طبیعت گڑبڑ ہونے لگتی ہے۔ یہاں سے رات کو چلیں گے نا تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنا نہ بھولنا۔ تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں غور سے ؟ ایسا لگتا ہے جیسے ابھی بولنے لگیں گی۔ ڈوروں میں لہو دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے صاف، منت خوشامد، گالی دھمکی، گھونسا لات، سب کچھ ہو ہوا چکا مگر وہ

ہے کہ انکار میں اس زور سے سر جھٹکتی ہے جیسے دیواروں پر چوٹیں مار رہی ہے، جیسے سچ مچ کبھی نہیں جائے گی، وہ بھی کیا کسان عورتیں تھیں بے چاریاں بالکل بھیڑیں، سیدھی سادی، ڈری ڈری، سہمی سہمی، بات بات پر جی جی کی رٹ، اور یہ نئی کسان لڑکی دیکھو، ایسی دلیر اور بہادر شہزادیاں مزدور گذری ہیں مگر کسان ماؤں نے ایسی بیٹیاں کہاں جنی تھیں! خیر مانے گی کیسے نہیں، پہنچے وہ ملک صاحب تک، اور کچھ نہیں تو پیر صاحب کا تیر بہدف حُب کا تعویذ تو ہے ہی۔

حلیماں جس کوٹھے میں بند ہے اس کے دو دروازے ہیں نا؟ دونوں پر پہرہ ہے نا؟ منشی کو ادھر نہ جانے دینا اسے بالکل پتہ نہ چلے، وہ کچھ کسانوں ہی کا ساتھ دے رہا تھا، ہم یہاں سے نکل جائیں، پھر دیکھو کیسے چمڑی ادھیڑ دیتا ہوں اس بدنصیب کی، کہتا تھا یہ کچھ ضروری نہیں کہ زمیندار کے مزارعے زمیندار کے ووٹر بھی ہوں، ایک کا تعلق زمین سے ہے دوسرے کا ضمیر سے —— افلاطون کا بچہ، حرامزادہ۔

حمزے یار، ایک بار پھر بتاؤ تم نے حلیماں کو کیسے پکڑا تھا، تم کالے خانیئے جب نوجوان لڑکیوں کی باتیں کرتے ہو تو خدا کی قسم وارث شاہ بن جاتے ہو، کوئی اس چھوکری سے پوچھے آخر منہ اندھیرے کوئیں پر جانے کی کیا ضرورت تھی، کہتے ہیں منہ اندھیرے کا بھرا ہوا پانی دن بھر ٹھنڈا رہتا ہے مگر یہ کسی دانا نے نہیں بتایا کہ منہ اندھیرے کی اُٹھائی ہوئی لڑکی کہیں ٹکتی بھی ہے یا اُٹھتی چلی جاتی ہے، اچھا تو وہ تمہارے ہاتھوں سے کیسے نکل نکل گئی؟ بتاؤ نا یار، تم نے شاید مکھن کے گولے کی مثال دی تھی، ان لڑکیوں پر نہ جانے اتنا گوشت کہاں سے آجاتا ہے،

کھاتی تو دال روٹی ہیں اور معلوم یوں ہوتا ہے کہ چھو لو تو انگلیاں گلابی ہو جائیں گی' اس دن تم نے وزیر صاحب کی وہ تصویر دیکھی ہو گی جو ملک صاحب نے چوپال میں لگائی ہے؟ میں نے ایک بار تصویر پر انگلی پھیری تو بے شمار ننھے ننھے سنہری ذرے چھٹے چلے آئے، خیال آتا ہے کوئی حلیماں کے بازو چھوئے تو ان کا سونا کیسے چھٹ آئے پوروں میں، —— میری انگلیوں میں تو جلن سی ہونے لگی ہے،

یہ شور کیسا ہے؟ منشی کو حلیماں کا پتہ تو نہیں چل گیا! ریوالور بھرلو۔ بھرا ہوا ہے؟ ذرا جھانک کر دیکھو تو —— یہ تو کسانوں کا ہجوم ہے۔ اور اُن کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں میں درانتیاں ہیں، حلیماں کا باپ سب سے آگے ہے، پچھلی کھڑکی سے کود جاؤ، فائر کرنا بیکار ہے، ایک دو کو مار کر اپنی بوٹیاں نچوا ڈالنا دانائی نہیں، مصری کو اطلاع دو، بھئی حمزے راستہ دو نا —— وہ آرہے ہیں، وہ بیٹھک کا دروازہ توڑ رہے ہیں، وہ ملک جی کو گالیاں دے رہے ہیں، وہ حلیماں کو پکار رہے ہیں، گھوڑوں پر زینیں کسنے کی بھی ضرورت نہیں ! ۔

حلیماں؟ تم حلیماں کی پوچھ رہے ہو؟ موت بیٹھک کا دروازہ توڑ رہی ہے اور تمہیں حلیماں کی پڑی ہے؟ سبحان اللہ! اور وہ تمہارے ساتھ بھاگے گی کیسے؟ وہ تو نئی کسان لڑکی ہے حمزے!

(۵)

گھوڑے ہانپ رہے ہیں، اور پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں، مگر ہمارا ستانا ٹھیک نہیں، ہو سکتا ہے کسان ہمارے تعاقب میں ہوں، اور پھر ان کھیتوں میں ہماری لاشیں گدھوں کی خوراک بن جائیں، اور بھئی جو لاشیں بغیر جنازے

کے ویرانوں میں پڑے پڑے سڑ جاتی ہیں وہ قیامت کے دن کون سا منہ لے کر اُٹھیں گی! میں نے تو اِس لیے جب بھی عید کی نماز پڑھی ہے، یہی دعا مانگی ہے کہ الٰہی، مجھے جنازے والی موت عطا فرما،۔

بھئی لگامیں ڈھیلی رہنے دو، ہو سکتا ہے وہ ہمارا پیچھا کر رہے ہوں ابھی جان بھی بچانا ہے، اور ملک جی کو بھی بتانا ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔ اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں، اور ان کے پاس تلی ہوئی درانتیاں ہیں،۔

یہ وہی زمینیں ہیں جہاں حضور لارڈ مونٹ مورینسی صاحب بہادر کے گھوڑے اور ملک جی کے کتے دوڑے تھے، اور اب انہیں زمینوں پر وہ کنگلے قلاش اپنے جھنڈے گاڑ دیں گے! ہائے وہ کتنی بڑی قیامت ہوگی! ہو سکتا ہے حضرت اسرافیل اس روز صور پھونک دیں، اس قیامت سے پہلے مر جانے کو جی چاہتا ہے،۔

تو کیا پھر ووٹوں کی دلالی نہیں ہو سکے گی؟ کیا ملک جی کے محل اور اصطبل سونے ہو جائیں گے؟ تو کیا اس روز سورج سوا نیزے پر نہیں اُترے گا جب یہ درانتیوں اور کھرپیوں، ہلوں اور ہتھوڑوں والے گنوار بستی بستی پر چڑھ دوڑیں گے اور کولہو سے لیکر فولاد کے کارخانے تک کو سارے ملک کی ملکیت بنا لیں گے، اور پٹوار خانے کی کھتونیاں سب بیکار ہو جائیں گی!

تو کیا انہیں کسانوں اور مزدوروں میں سے کوئی فوج کی کمان بھی کرے گا؟ اور جب یہ لوگ باہر کے ملکوں میں لٹھ اُٹھا کر جائیں گے تو دنیا نہیں ہنسے گی،؟ اور ان کی ایڑیوں کی دراڑوں سے رستا ہوا خون اس فرش کو گندہ نہ کرے گا جہاں

میلکم ہیلی اور مونٹ مورینسی اور گلینسی صاحب بہادر آرام فرما چکے ہیں ——
تو یعنی کیا سارا حسن مرجائے گا؟ امیری کے سارے ٹھاٹ دھرے رہ جائیں گے؟
اور یوں اونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے گا،۔

یار، تم اب تک حلیماں ہی کی باتیں کئے جا رہے ہو وہ تو ایسی بلا کی لڑکی تھی کہ معلوم ہوتا تھا اس کے جسم کا رواں رواں ڈنک ہے اور پھر ایسے کسان بھی کہیں دیکھے ہیں کہ اپنے ملک صاحب کی جگہ جانے کس بھک منگے کو ووٹ دیں گے جسے اسمبلی ہال میں جانے کے لئے مانگے کی شیروانی بھی نہ ملے!

ارے میری شیروانی کہاں ہے؟ وہ تو وہیں خنشی مانے ہی میں —— منشی خانے ہی میں رہ گئی! اسی میں تو تھا وہ پانچہزار ہزار کا ہندہ جو ہم پانچوں کو آپس میں بانٹنا تھا۔ حمزے میرے ساتھ ساتھ چلو میرا سر گھومنے لگا ہے، اور وہ منشی کا بچہ اُن حرامزادوں کے ساتھ ملا ہوا ہے صاف، اب میں کون سا منہ لے کر ملک صاحب کے سامنے جاؤں،۔

پانچہزار بھی وہیں رہے، حلیماں بھی وہیں رہی، عزت آبرو بھی وہیں رہی، ووٹ بھی وہیں رہے، اگر ہم کچھ اپنے ساتھ لائے ہیں تو وہ ایک لرزہ ہے ایک کپکپی ہے —— اور ایک یقین کہ یہ ہمارے ملک صاحب کا آخری الکشن ہے۔ یہ تمہارے ہدایت اللہ کی آخری دلالی ہے، اور دوستو، ان زینوں پر تمہاری یہ آخری سواری ہے —— اور مجھے اپنے عقب میں درانتیاں بجتی ہوئی سُنائی دے رہی ہیں، اور غضب خدا کا، جھٹپٹے کی دھند میں دوسری تاریخ کا چاند بھی دندانے دار ہو رہا ہے!

جب یاد تمہاری آئی ہے دل خون کے آنسو روتا
ہے یہ دور زمانہ کیا جانے اس پیار میں کیا کیا پڑتا ہے

کہانی لکھی جا رہی ہے

میں بچے کو جھجر میں سے پانی پلانے کے لئے رکا تو وہ میرے پاس آیا، میں سمجھا وہ پیاسا ہے، اس لئے میں نے خاموشی سے جھجر اس کی طرف بڑھادی، مگر وہ مسکرانے لگا اور بولا "نہیں، مجھے پانی نہیں چاہئے۔"

وہ پگڈنڈی پر بہت آگے جا رہا تھا اور پلٹ کر میرے پاس آیا تھا اس لئے میں نے سوچا، اسے مجھ سے کچھ نہ کچھ تو ضرور چاہئے، "کیا چاہئے تمہیں؟" میں نے بچے کو پانی پلاتے ہوئے پوچھا۔

"کہانیاں" وہ بولا۔

اور گاؤں چھوڑنے کے بعد شائد پہلی بار ہم سب مسکرائے، فاطمہ تو ہنسنے لگی، اسے مسکرانا آتا ہی نہیں، وہ ہمیشہ ہنستی ہے، اب کے بھی وہ ہنس دی، اتنی بھاری گٹھڑی اور دکھتے پاؤں کے باوجود ہنس دی، اور فاطمہ کی طرف دیکھ

کر وہ بولا ۔" مجھے کہانی مل گئی ۔"

فاطمہ اور زور سے ہنسنے لگی ، بچے نے خواہ مخواہ اپنی ماں کی ہنسی میں شامل ہونا چاہا تو منہ کا پانی ناک میں آگیا ، ہنسی اور کھانسی کے بین بین اس نے عجیب عجیب آوازیں نکالیں تو مسافر نے اسے اٹھا لیا ، اور اس کے ننگے پاؤں پر جمی ہوئی دھول کو اپنے ہاتھ سے جھاڑتے ہوئے بولا " تم کہاں جاؤ گے ۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے کہاں جانا تھا ! مجھے کہیں نہیں جانا تھا اور ہر جگہ جانا تھا ، میرے سفر کی کوئی سمت مقرر نہیں تھی ، میں بگولے میں پھنسا ہوا ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا ، میں اپنے گاؤں سے نکل آیا تھا کیونکہ میں نے ایک روائت سے بغاوت کی تھی ، اب میں وہ کہانیوں والا گاؤں ڈھونڈنے چلا تھا جہاں کے کھیتوں میں گیہوں کی بالیں موتیوں سے بھری رہتی ہیں اور کنواریاں کھلیانوں پر بیٹھ کر اور درختوں میں چھپ کر الغوزے بجاتی ہیں اور منہ زور گھوڑوں پر سوار ہو کر زمیندار زادے ان موتیوں کو لوٹنے اور ان الغوزوں کو توڑنے نہیں آسکتے ہیں ، وہاں زمیندار ہوتے ہی نہیں ، وہاں خوبصورتی ہوتی ہے اور امن اور خوش حالی اور فاطمہ کے قہقہے اور بچے کی تتلیاں ، ——
وہاں زندگی کے حسن کے دبدبے سے موت کو تھرتھری چھوٹ جاتی ہے ۔

مگر میں اس سوئی ہوئی آنکھوں والے مسافر کو یہ سب کچھ کیسے بتاتا ، میں نے کچھ دیر تک اس کے سوال کا جواب سوچا اور جب کچھ نہ سوچ سکا تو فاطمہ کی طرف دیکھا ، اور فاطمہ نے میری طرف دیکھا ، جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر ہمیں کہاں جانا ہے ، بچہ مسافر کے کندھے

پر سوار ہو چکا تھا، اس نے ایک مٹھی میں مسافر کے بالوں کو جکڑ رکھا تھا، اور دوسرے ہاتھ سے اس کی قمیص کا کالر مروڑ لیا تھا، اور مسافر نے توازن قائم رکھتے ہوئے ایک ہاتھ سے بچے کا گرد آلود پاؤں تھام لیا تھا اور دوسرے سے اس کی پیٹھ کو تھپتھپا کر اپنا سوال دہرا رہا تھا۔ "بھئی کہاں جاؤ گے تم لوگ؟"

اس مسافر کو آخر ہم سے کیا لینا تھا، یہ کون تھا جو بہت آگے جاتے ہوئے پلٹ کر ہمارے پاس آیا تھا، اور اب ہمارے بچّے کو کندھے پر بٹھائے اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا، فاطمہ اس کے کندھے پر سے بچے کو اتارنے کے لئے بڑھی تو وہ بولا۔ "مجھے کچھ دیر تک تمہارے ساتھ چلنا ہے، اور بچہ تھک گیا ہے، اس کے تلوے جل رہے ہیں، میں جھیل کے کنارے ان درختوں تک تمہارے ساتھ چلوں گا، مجھے تمہاری کہانی لکھنا ہے۔"

جھیل جسے نوجوان سورج نے ایک بیضوی سی پتری بنا کر دھندلے بھورے پہاڑ کے دامن میں ٹانک دیا تھا، ابھی بہت دور تھی، اور درخت تو اس سے بھی دور تھے، کیونکہ وہ پرلے کنارے پر تھے اور یہاں سے دھوئیں کی ایک کترن معلوم ہو رہے تھے، اور اگرچہ پگڈنڈی ہموار وادی میں سے گزرتی تھی، اور آس پاس دور دور تک سبزہ اُگ رہا تھا، جس پر ہلکے اودے رنگ کے کبوتر چہل قدمی کر رہے تھے، اور ممولے ہوا سے اتر کر ان پر لمبی لمبی دوڑیں لگا رہے تھے، اور بھیڑیں اُون کے ڈھیروں کی طرح جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھیں، اور رنگ رنگ کی تتلیاں جا بجا پروں کی پنکھیاں چلا رہی تھیں، مگر دھوپ بہت تیز تھی اور سفر لمبا تھا، اور پھر ہم یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ اگر اس پگڈنڈی میں سے کوئی دوسری پگڈنڈی

نکل آئی تو ہم اس پر نہیں چل دیں گے، ہماری منزل جھیل کے کناروں پر درختوں کے چھتنارے نہیں تھے، ہمیں تو اس گاؤں میں جانا تھا جہاں سنا ہے کہ گیہوں کی بالیاں موتیوں سے لدی رہتی ہیں اور جہاں زندگی مسکرائے تو موت کو تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔

ہم پگڈنڈی پر چپ چاپ چلنے لگے اور میں سوچنے لگا کہ کہانیاں تو بادشاہوں اور وزیروں اور امیروں کے بارے میں لکھی جاتی ہیں، ان کہانیوں میں شہزادیاں چرواہوں کی تلاش میں نکلتی ہیں اور چرواہیوں پر شاہزادے فدا ہو جاتے ہیں اور زندگی طوطے کے پیٹ اور سانپ کے پھن میں مقید رہتی ہے، یہ کیسا کہانیاں لکھنے والا ہے کہ حیران حیران پگڈنڈیوں پر چلنے والے لٹے ہوئے کسانوں سے کہانیاں لینے آیا ہے، میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ بچّے سے باتیں کر رہا تھا اور بچہ مارے جھجک کے گلابی ہوا جا رہا تھا، مسافر کہہ رہا تھا "میں تمہیں اس جادوگر کی کہانی سناؤں گا جس نے آسمان کو تاروں سمیت لپیٹ کر اپنی بقچی میں رکھ لیا تھا، اور جب بقچی میں بے چارے فرشتے کلبلاتے تھے تو وہ چیخ چیخ کر ہنستا تھا اور کہتا تھا "ایک روٹی کا سوال ہے، ایک روٹی ہر روز لا دو تو ابھی آسمان کا شامیانہ تانے دیتا ہوں"۔ —— اب بچہ مارے خوشی کے گلابی ہو رہا تھا۔

میں نے ایک بار فاطمہ سے پوچھا تھا کہ آخر یہ لڑکا سوکھی روٹی اور پتلی چھاچھ پینے کے باوجود اتنا موٹا اور گلابی کیوں ہے، اور فاطمہ نے بتایا تھا کہ معصوم بچّے فرشتے ہوتے ہیں، اور ان فرشتوں پر خدا کا سایہ ہوتا ہے، اور پھر جب میں نے اسے قادر کے بچے کا حال بتایا تھا جو خیراتی ہسپتال میں مر گیا تھا اور جس

کی جلد تک گل کر گرنے لگی تھی، تو فاطمہ نے لپک کر اپنے بچے کو اٹھا لیا تھا، اس کے گالوں سے اپنے گال یوں ملا لیئے تھے، جیسے اپنی جوانی کا سارا رنگ وہ اپنے بچے کے مساموں میں اتار رہی ہے، ــــ اور اب بچہ صرف جھجکتے، شرماتے، حیران ہوتے اور مسکراتے ہوئے گلابی ہو گیا تھا، اور اب میں سوچتا تھا کہ شائد کسی وقت حیرت اور مسرت کا یہ گلاب بھی مرجھا جائے، اور بچہ اس پگڈنڈی کے کنارے صرف دم توڑتے وقت ہی گلابی ہو سکے اور پھر سرسوں کے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ہوا میں اڑ جائے، "مرتے وقت تو سب رنگ اڑ جاتے ہیں!" فاطمہ نے کہا تھا اور پھر چونک کر مجھے یوں ڈانٹا تھا جیسے اس نے بچے کو دودھ کی جگہ آبِ حیات پلا رکھا ہے اور وہ ان فاقوں اور لمبی مسافتوں اور موسم کی زیادتیوں کے باوجود زندہ رہے گا اور گلابی رہے گا۔

کچھ باتیں کرنے کے لیئے میں تیزی سے چل کر مسافر کے برابر آ گیا تو جھجر میں پانی چھلک اٹھا اور مسافر رُک کر بولا ــــ "بھئی مجھے بھی پانی پی لینا چاہیئے، جھیل تو دور ہی دور ہٹتی جا رہی ہے۔"

فاطمہ حسب معمول زور سے ہنسی اور مسافر نے بچے کو کندھے پر سے اُتار کر پانی پینے کے لیئے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنایا، اور جب میں نے جھجر کے دہانے پر سے گیلے چیتھڑے کا ڈھکنا اٹھایا تو فاطمہ بولی "کیوں نہ ان سامنے کی بکائنوں تلے "دوپرا" کریں، بھوک بھی لگی ہے اور ادھر کہیں سے کوئیں کی رُوں رُوں بھی سُنائی دے رہی ہے، جھجر بھی بھر لائیں گے۔"

مسافر نے ہاتھوں کا پیالہ توڑ دیا اور بولا "سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو بہتے

چشموں اور چلتے کنوؤں کا پانی پینے میں لطف آتا ہے، میں جھجھر بھی بھر لاؤں۔ اور" "اور تھوڑی سی آگ بھی مانگتے لانا۔" فاطمہ نے بکائنوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف اشارہ کرکے بولی "اسے چائے پینے کی لت ہے"۔ مسافر کے چہرے پر کچھ ایسا رنگ آگیا جیسے اسے ایک اور کہانی مل گئی ہے، ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے میرے ہاتھوں سے جھجھر لے لی اور رہٹ روں روں کی آواز معین کرکے ایک طرف جانے لگا، بچہ اس کے پیچھے بھاگا۔ فاطمہ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اب مسافر کے کندھے پر سوار ہو چکا تھا اور مسکرا مسکرا ہمیں دیکھتا جاتا تھا۔

ہم بکائنوں کے جھنڈ میں آگئے، جا بجا بھیڑوں بکریوں کی مینگنیاں پڑی تھیں جو خشک ہو کر بڑا اچھا ایندھن بن گئی تھیں، ٹھنڈی ہوا بھی گرمی سے گھبرا کر جیسے یہیں "ڈیرا" کر رہی تھی، ساری وادی کی چڑیاں بھی یہیں جمع تھیں۔ "بس ایک رکارڈوں والے باجے کی کمی ہے"۔ فاطمہ نے گٹھڑی اتار کر بیٹھتے ہوئے کہا، پھر ایک دم زور زور سے ہنستی ہوئی جھکی اور گٹھڑی میں منہ چھپا لیا۔

رکارڈوں والا باجا میری چڑ تھی، وہ یوں کہ شادی سے پہلے میں جاگیرداروں کے باجرے کے ایک کھیت میں چوری چھپے گھاس کاٹنے گیا، باجرے کے پودوں کے ارد گرد گھاس اتنی گنجان اور اونچی تھی کہ میں درانتی چلاتے ہوئے، بالکل نشے کی سی حالت میں، ادھر ادھر دیکھے بغیر ناک کی سیدھ میں آگے ہی بڑھتا گیا اور جب میں کھیت کے وسط میں پہنچا، تو اچانک گھاس میں ڈوبی ہوئی میری درانتی کو کسی نے جکڑ لیا، میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو سہمی ہوئی

فاطمہ بیٹھی تھی اور اس کی درانتی کو میری درانتی نے جکڑ لیا تھا، وہ بھی چوری چھپے گھاس کاٹ رہی تھی، وہ بھی ناک کی سیدھ میں، نشے کی سی حالت میں بڑھی چلی آئی تھی، کچھ دیر سہمے رہنے کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کی نیتیں آنکھوں آنکھوں میں پڑھ لیں، میں تو خیر مسکرا دیا مگر فاطمہ اپنی ہنسی پر ضبط نہ کرسکی، اور اگر اس کی پیٹھ پر لٹکی ہوئی چادر کی "جھولی" میں گھاس کا ایک انبار نہ ہوتا، تو وہ یقیناً ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں پیچھے لڑھک جاتی، مارے خوف کے میں نے اسے خاموش رہنے کو کہا، لیکن جب وہ ہنستی ہی چلی گئی، تو میں نے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، اور وہ ایک دم خاموش ہوگئی، اور میں نے بھی اپنا ہاتھ فوراً ہٹا لیا، گنجان گھاس میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے اور جب درانتی اس نشے کو بکھیرتی ہے تو اچھے اچھوں کو نیند آلیتی ہے، شائد اسی لیے میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر فاطمہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا، اور اب اپنے ہاتھ کو یوں پکڑے بیٹھا تھا جیسے بھول کے دھوکے میں انگارا چھو لیا ہے، بعد میں فاطمہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس روز اس کی ہنسی اچانک یوں رُک گئی جیسے رکارڈ پر سے "سون بکس" اٹھا لیا جاتا ہے —— پھر جب ہماری شادی ہوئی تو پہلے ہی روز اس نے رکارڈوں والے باجے کی فرمائش کردی، اور جب میں نے فصل اٹھانے کے بعد کا وعدہ کر لیا اور فصل اٹھی ——، مگر یہ تو بہت لمبی بات ہے، کہنا صرف یہ تھا کہ وہ جب بھی مجھے چھیڑنا چاہتی، باجے کا ذکر کردیتی، پہلے تو خیر میں خفا ہونے لگتا تھا، لیکن اب اُداس ہو جاتا تھا، اور وہ جھینپ جاتی تھی، اب کے بھی اس نے میری طرف کچھ اس

کے ہاتھوں سے کانچ کا پیالہ بے جانے بوجھے گر کر ٹوٹ گیا ہے،

مجھے فاطمہ پر رحم آ گیا، میں نے اس کے گال تھپتھپا دیئے مگر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، اور آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس نے پلٹ کر چادر سے مُنہ ڈھانپ لیا، میں نے کہا۔ "فاطمہ، تم رو رہی ہو اور پھٹے ہوئے چولے میں سے تمہاری پیٹھ ہنس رہی ہے!"

وہ بے اختیار ہنس دی، ادھر اس کے گالوں پر آنسو پھیل گئے تھے، ادھر ہنسی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اور اب میں اداس ہو گیا، مجھے فاطمہ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ اپنی کسی نہ کسی حرکت سے مجھے گزرے ہوئے زمانے میں لے جاتی ہے، کبھی کبھی وہ بالکل ایک ماں کی طرح میرا ماتھا چوم لیتی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ گلی ڈنڈا اٹھا کر باہر میدانوں میں نکل جاؤں اور گلی پر ایسی ایسی زناٹے کی ضربیں لگاؤں کہ گلی ہواؤں سے سیٹی بجاتی ہوئی گزر دے، پھر اسے ماہیئے کی بڑی کافر کلیاں یاد تھیں، —— "جنگل پھلاہی ہو واں پئی پھٹاں بہاراں نا"۔ اور مجھے وہ دن یاد آ جاتے ہیں جب "پھلاہیوں" کے سائے تلے بیٹھ کر میں نے ان کی ننھی ننھی پتیوں کی خوشبوئیں پی ہیں اور دور جرانش کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ہواؤں کے مسلسل گیت سُنے ہیں اور یوں صبح سے شام کر دی ہے، انسان یا تو ساری عمر بچہ ہی رہے یا بوڑھا ہی پیدا ہو، دُکھوں سے بچنے کا صرف یہی طریقہ ہے۔

مسافر جھجر بھی بھر لایا اور دو اپلوں پر آگ بھی رکھ لایا۔ وہ بچّے کو کندھے پر سے اتار کر فاطمہ کو چولہا بنانے میں مدد دینے لگا تو میں نے اس سے ریکارڈ دل

والے باجے، اور فاطمہ کے رونے اور چولہے میں سے اس کی جلد کی ہنسی کی ساری باتیں کہہ دیں، اصل میں وہ تھوڑی ہی دیر میں ہم سے کچھ ایسا گھل مل سا گیا تھا کہ بالکل اپنا لگتا تھا، فاطمہ جھینپتی رہی، مسافر ہنستا رہا، اور پھر جب میں نے گذرے ہوئے زمانے کو گالی دی تو وہ دھواں چھوڑتے ہوئے اُپلوں کی آگ کو زندہ رکھنے کے لئے اس میں پھونکیں مار رہا تھا، اس نے اُپلوں کو چولھے میں رکھ دیا اور بڑا عجیب سا چہرہ بنا کر، بالکل انگریزی روپے والی مورت کی سی صورت بنا کر میرے قریب آیا اور بولا۔ "گزرے ہوئے زمانے کو گالی نہ دو، گزرا ہوا زمانہ ہم سے کچھ نہیں چھینتا، کچھ نہ کچھ دے ہی جاتا ہے۔"

کوئی شخص یہ بات منبر پر کھڑے ہو کر کہہ دیتا تو مجھے حیرت نہ ہوتی، کیونکہ منبر پر کھڑے ہو کر تو لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اکہتر بار قل ہو اللہ شریف پڑھنے سے انسان سیدھا جنت میں جاتا ہے، اور اگر جنت میں جانا ایسا ہی آسان ہوتا تو دوزخ بنانے کی کیا ضرورت تھی — گذرا ہوا زمانہ کچھ نہ کچھ دے ہی جاتا ہے! — خاک دے جاتا ہے، کچوکے، ٹیسیں، ٹھیسیں — مجھے درانتی میں درانتی پھنستی محسوس ہوئی، اور پھر بچہ رونے لگا، اسے ایک چیونٹے نے کاٹ لیا تھا، فاطمہ نے لپک کر بچے کے ٹخنے پر سے چیونٹے کو نوچا اس کا دھڑ الگ ہو گیا اور سر وہیں جلد میں گڑا رہ گیا، اور وہ اندھا دھند ہنسنے لگی اور درانتی میں درانتی پھر پھنس گئی!

"کیا دے جاتا ہے گذرا ہوا زمانہ؟" میں نے مسافر سے پوچھا،

"کچھ نہ کچھ تو دے ہی جاتا ہے"، وہ بولا۔ اور زمین پر سے چند خشک پتے

اُٹھا کر سوکھی ہوئی مینگنیوں سے بھرے ہوئے چولھے میں ڈال دیے،" ارادہ دبے جاتا ہے، اور امید اور امنگ، اور عبرت۔"

مجھے وہ پھر منبر پر کھڑا نظر آیا،

"بات یہ ہے" اس نے بڑے اطمینان سے ادھر ادھر سے مینگنیاں جمع کرتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ بیل اور آدمی میں صرف ایک فرق ہے، آدمی سوچ سکتا ہے، بیل نہیں سوچ سکتا۔"

"بیل تو دھڑلّے سے سوچتا ہے۔" فاطمہ نے گٹھڑی میں سے چائے کی پتی نکالتے ہوئے کہا۔" ہمارا ایک بیل تھا۔ ہم اسے نقرہ کہتے تھے، جب ہم نقرے کو ہل پر لے جانے لگتے تو وہ بیٹھ جاتا تھا، اور جب ہم اسے بہت تنگ کرتے تھے اور اس کی دم مروڑتے تھے اور اس کے جسم میں لکڑیاں چبھوتے تھے، تو وہ لیٹ جاتا تھا، نقرہ پہلے سے سوچ لیتا تھا کہ اب بھادوں کی دھوپ میں دن بھر کھیتوں میں بھننا ہوگا، وہ تو اس سے بھی زیادہ سوچتا تھا"۔ فاطمہ نے میری طرف اشارہ کیا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگی، مسافر بھی خوب ہنسا بچہ جس نے چیونٹے کا سر نوچ کر زخم پر خود ہی مٹی ڈال لی تھی، مسکراتا ہوا اس کے قریب آگیا، اور میں اداس ہو گیا،

چڑیاں اُڑ گئی تھیں، دھواں جھکی ہوئی ٹہنیوں سے لپٹتا ہوا اوپر گھنے پتوں میں گھس رہا تھا، سیاہ رنگ کے موٹے موٹے چیونٹے جھجر کے ارد گرد جمع ہو کر قیلولہ کر رہے تھے، ایلومینیم کی بھدّی کیتلی میں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ میں چائے کی پتیوں کی خوشبو تھی، اور ہوا میں بکائنوں کی خنکی تھی، ایک بھونرا کہیں

سے آیا اور دھوئیں سے گھبرا کر زن سے باہر نکل گیا، مسافر کھلی ہوئی گٹھڑی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا،

"سرمہ دانی" بچہ بولا، اور پھر مسافر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نئے سوال کا انتظار کرنے لگا، معلوم ہوتا تھا اسے گٹھڑی میں بندھی ہوئی چیزوں کی ملکیت کا شدید احساس ہے،۔

"میں لگا لوں ذرا سا؟" مسافر نے پوچھا،

"ماں کا ہے" وہ بولا، — اور پھر بقراط بن گیا، "دن کو نہیں لگاتے سرمہ، جن عاشق ہو جاتا ہے"۔

"ارے!" ہم ایک دم ہنس دئے اور بچہ جھینپ گیا،۔

"میں نے دن ہی کو لگایا تھا سرمہ" فاطمہ بولی، "اور جاگیردار کے کھیت سے گھاس چرانے چلی گئی تھی۔" فاطمہ اور مسافر یک بارگی اس زور سے ہنسے اور فاطمہ کے مذاق سے میں کچھ ایسا چکرا گیا کہ نہ ہنس سکا اور نہ جھینپ سکا، اور یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جب انسان اور اُلّو میں صرف چونچ کا فرق رہ جاتا ہے۔

خوب جی بھر کر ہنس لینے کے بعد مسافر نے اب کے چیتھڑوں سے بنی ہوئی ایک گیند اٹھائی جس پر میں نے ریشم کے دھاگوں سے جالی کاڑھی تھی۔ "یہ کیا ہے؟"

"کھیلو گے؟" بچے نے گیند چھین کر مسافر سے پوچھا۔

"بکائنوں تلے گیند کھیلا جائے تو پریاں عاشق ہو جاتی ہیں" مسافر بولا،۔

اور ہم سب ہنس دئے، مگر بچّے نے اچانک ایک تتلی دیکھ لی تھی اور گیند کو زمین پر پھینک کر وہ بکائنوں تلے اس کے پیچھے ایک دائرے میں بھاگنے لگا، پھر تتلی باہر اُڑ گئی تو وہ بھی باہر بھاگا اور دور تک بھاگتا چلا گیا۔

مسافر نے میری بنسری، میرے الغوزے، آئینے کا ایک ٹکڑا، سوئی دھاگے کی ننھی سی پٹاری، تیل کی شیشی جس کے دہانے پر کپڑے کا نچا ہوا بھٹا بھنسا ہوا تھا، لکڑی کی کنگھی، چنے اور مونگ کی دال کی پوٹلیاں، غرض سب کچھ ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر انہیں قرینے سے رکھ کر بولا "بس یہی کچھ ہے تمہاری پونجی؟"

"اور کیا ہوتی" میں نے کہا۔

"کسان ہو نا؟"

"ہاں"

"بیل کہاں ہیں؟"

میں خاموش رہا، خاموش رہنا ہی اچھا تھا، ہر انسان دکھی ہے، اور دکھوں کو بانٹنا اچھا نہیں ہوتا، اس نے مجھ سے مایوس ہو کر فاطمہ کی طرف دیکھا،

"بک گئے" وہ بولی،

"کیوں؟" مسافر نے پوچھا،

"ریکارڈوں والا باجہ خریدنا تھا" فاطمہ سنجیدگی سے بولی "پر جاگیردار نے کہا کہ یہ رقم اس کی زمین پہ اُگے ہوئے غلّے کو ناجائز طور پر بیچ کر حاصل کی گئی ہے، وہی لے گیا"۔

"جن کا بچہ تو تھا وہ کمبخت" مسافر نے اپنی طرف سے سنجیدگی اور اداسی

کا غول توڑنا چاہا، اور ہنسا، مگر فوراً اپنی ہنسی کی تنہائی محسوس کر کے بکائنوں کے تنوں میں سے دور جھیل کو دیکھنے لگا۔

پھر جب مٹی کے دو پیالوں میں فاطمہ نے ہمیں چائے دی تو مسافر کے چہرے پر سختی سی آگئی، اور وہ جیسے بہت پریشان ہو کر بولا "بھئی آخر تم کون ہو اور تمہیں کہاں جانا ہے؟"

تتلی پھر بکائنوں کے جھنڈ میں گھس آئی تھی اس لئے بچہ بھی بھاگا بھاگا وہاں پہنچا اور ہمارے سامنے چائے کے پیالے دیکھ کر اپنی کٹوری کے لئے مچلنے لگا، وہ ہر روز اس کٹوری کے لئے مچلتا تھا اور بدقسمتی سے اسے ہم گٹھڑی میں رکھنا بھول گئے تھے، مسافر نے اسے دلاسہ دیا اور وہ چپ چاپ ایک سعادتمند شاگرد کی طرح مسافر کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت دھوپ سنہری ہو گئی تھی اور میدان میں اکا دکا درختوں کے سائے ان کے قدموں سے لمبے ہو گئے تھے۔ چڑیوں کا غول پھر سے بکائنوں کے جھنڈ پر اتر آیا تھا، اور خوب تو تو میں میں ہو رہی تھی پگڈنڈی پر ایک عورت اور ایک مرد جا رہے تھے، عورت کے سر پر چرخہ تھا اور مرد نے گٹھڑ میں روئی کا ایک ڈھیر باندھ کر اسے پیٹھ پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں خوب باتیں کرتے جا رہے تھے —— پھر اچانک بکائنوں کی پھننگوں پر کسی نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا، تیز چھرر کی آواز پیدا ہوتی، چند پتے ہوا میں ڈبکیاں لگاتے ہمارے آس پاس آن گرے، چڑیاں بہت سی گیندوں کی طرح فضا میں بکھر گئیں، اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

مسافر جو اپنے سوال کے جواب کے انتظار میں ابھی پیالے کو لبوں تک نہیں لے جا سکا تھا، میری طرف حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ اور میں نے اس کے دوسرے سوال کا جواب دیا "باز یا شکرا چڑیوں پر جھپٹتا ہے"!

"اور شکرے پر کون جھپٹتا ہے؟" مسافر نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا،

"چڑیاں ایکا کر لیں تو اس پر جھپٹ سکتی ہیں۔" فاطمہ نے جواب دیا "شکرا فدا بڑی قسم کی چڑیا ہے نا —— اور آخر چڑیا ہی ہے نا"!

"چائے پیو بھئی" میں نے کہا، بات خواہ مخواہ ایک ایسا رخ اختیار کر رہی تھی جب جبڑے بھنچ جاتے ہیں اور کنپٹیوں میں فتیلے سے جل اٹھتے ہیں،۔

وہ چائے پینے لگا، لیکن کچھ اس طرح جیسے کہانی سوچ رہا ہے، پھر وہ بچے کو بھی اپنے ہی پیالے میں سے چائے پلانے لگا۔

"تمہیں کہاں جانا ہے؟" مسافر اپنی ہٹ پر بدستور قائم تھا"۔

فاطمہ میری طرف دیکھنے لگی، چڑیوں پر شکرے کے حملے کے بعد اس کی وہ مسکراہٹ بھی غائب ہو چکی تھی جو اس کے لبوں کے گہرے گوشوں میں ہمیشہ دبکی رہتی تھی، وہ نہایت سختی سے بولی "بتاتے کیوں نہیں صاف صاف کیا تم چوری کر کے آ رہے ہو؟ کیا کوئی ڈاکہ ڈالا ہے تم نے؟ تم نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، خدا کو یہی منظور تھا، پھر تم اسے چھپاتے کیوں ہو؟ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ جاگیرداروں نے تم سے زمین چھین لی ہے اور گاؤں سے نکال دیا ہے۔ اور اب ہم —— اب ہم جانے کہاں جا رہے ہیں، تمہارے گھٹنے پر چیونٹا چڑھ گیا ہے، جھٹک دو اسے۔"

میں نے چیونٹے کو جھٹک دیا اور چائے پی کر اطمینان سے بولا "بات یہ ہے بھائی ـــ" اور پھر میں سورج کی طرف دیکھ کر چونکا۔ "بات یہ ہے کہ دیر ہو رہی ہے، ہمیں شام تک کسی آبادی میں پہنچ جانا چاہیئے۔"

لیکن اس روز تو میں فاطمہ کی ضد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلی بار میں نے اس کی بھوؤں کے درمیان شکن دیکھی۔ وہ زور زور سے بولنے لگی۔ "اوے کتراتے کیوں ہو؟ بتاتے کیوں نہیں؟ چار راتیں ویرانے میں گذار دیں اور آج آبادی تک پہنچنے کی دھن سوار ہے! وہاں آبادی میں ہمارا ابّا بیٹھا ہے کہ پلنگ بچھا دے گا اور شربت گھول دے گا؟ ـــ پگلا!"

اس نے کیتلی کو یوں جھٹکا دے کر اٹھایا کہ اس کی ٹونٹی سے گھونٹ بھر چائے گر گئی، پھر وہ خالی پیالہ بھر کر بولی۔ "بات یہ ہے بھیا کہ ہم بہت دکھی ہیں، قصور یہ ہے ہمارا کہ ہم جاگیردار کے جن کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں ان کی پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ ہمیں ملتا ہے، اور اس کی ایک چوتھائی میں سے بھی کئی نذرانے پیش کرنے پڑتے ہیں، باپ دادا کے زمانے سے یہی دستور چلا آتا ہے، اس نے چند سرپھروں سے مل کر شور مچایا کہ ہم اب کی پیداوار کا آدھا حصہ لیں گے، اس نے اپنا حق مانگا تھا پر ـــ" اس کی آنکھیں اچانک چمک اٹھیں ـــ "پر شکرے پر جھپٹنے کے لئے سب چڑیوں کا ایکا بھی ضروری ہے، اور یہ تھے کل چار پانچ سرپھرے، جاگیردار کے کان میں اس کی بھنک پڑی تو اسے پٹوایا بھی اور گاؤں سے بھی نکال دیا، اس کے دو ساتھی زخموں سے چور قصبے کے ہسپتال میں پڑے ہیں

اور ہم چار روز سے سفر کر رہے ہیں، ۔۔۔ یونہی ۔۔۔ بس چلے جا رہے ہیں، بچہ چلتے چلتے ادھ موا ہو جاتا ہے تو ہم اسے اٹھا لیتے ہیں، اور پھر خود ادھ موئے ہو جاتے ہیں، اس کو وہ مار پڑی ہے کہ زخم نظر نہیں آتا پر دکھن ہڈیوں میں اتری ہوئی ہے، زور سے ہنسے تو پسلیاں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے، سب عزیز رشتہ دار جاگیر دار کے مزارعہ ہیں، ہم سے ہمدردی کرتے تو پٹتے بھی اور گاؤں سے بھی نکلتے، یہ کہتا ہے کہ خدا کی زمین تنگ نہیں، میں کہتی ہوں کہ جاگیردار کی زمین تو تنگ ہے نا۔ اور خدا کی ساری زمین آج جاگیردار کی زمین ہے، پھر ہم کہاں جا کر سر پھوڑیں گے؟ ہزار بار کہا کہ پلٹ چلیں، باپ دادا کا پسینہ جس زمین پر ٹپکا ہے اسی میں برکت ہے پر یہ ہے کہ بس ایک بزدلی سوار ہے اور ۔۔۔"

"اے فاطمہ" میں نے اسے شاید پہلی بار گھرکا، اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں، مجھے جکڑ لیا، مجھے گزرے ہوئے زمانے کی طرف گھسیٹ لے گئی، اور میں نے مسافر کی پروا کئے بغیر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا "فاطمہ، آگے میں بتاتا ہوں، تم چائے پی لو"۔

فاطمہ نے ایک ہی سانس میں پیالہ پی کر کیتلی چھلکائی اور پیالے کو پھر بھرنے لگی،۔

میں نے فاطمہ ہی کی باتیں دہرا دیں اور آخر میں کہا۔ "جانتا ہوں کہ ان جھیلوں اور پہاڑوں سے پرے میرے لئے فاقوں کے سوا اور کچھ نہیں، پر سچی بات کہوں میں پلٹ کر گاؤں نہیں جاؤں گا، معافی مانگنے کو ذلت سمجھتا ہوں اور معافی نہ مانگوں تو اکیلا ہوں، میرے ساتھی ہسپتال سے بچ کر نکلے بھی تو نکمے ہوں گے بے چارے، ان

کی ٹانگوں اور باہوں کے ٹوٹنے کی آواز خود میں نے سنی ہے، اور کسانوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ان ہسپتالوں میں نہیں جڑ سکتیں، گھوڑے سے گر کر جاگیردار کی کھوپڑی ٹوٹی تھی تو ہڈیوں کی کرچیاں تک جڑ گئی تھیں، دولت کے معجزے ہیں۔"

مسافر تنکے توڑے جارہا تھا، اوپر چڑیوں نے پھر سے غل مچادیا تھا، بچہ ایک اور تتلی کے تعاقب میں پگڈنڈی تک جا پہنچا تھا، فاطمہ پیالے دھو کر گٹھڑی میں باندھ رہی تھی، مسافر نے میری طرف نہائت آزردگی سے دیکھا اور بولا۔" آج کل میں جہاں بھی گیا ہوں، پرانے مزارعوں کو زمینوں سے نکالا جارہا ہے، تمہاری ہڈیاں ٹوٹی ہیں، وہاں گھروندے جلے ہیں اور مزارعوں کی بیٹیوں کی عصمتیں لٹی ہیں، تم لوگ اپنی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر میدان میں کود پڑے ہو، شیر بھی اپنے شکار پر سوچ کر جھپٹتا ہے، اور پھر تم زمینداروں سے ہزار الجھو، پٹواری کی کھتونی تو ہمارے بس میں نہیں، وہاں قانون کا پہرہ ہے، — لیکن یہ ایسی فکر کی بات بھی نہیں، یہیں کہیں کسی دوسرے گاؤں میں تمہیں زمین مل جائے گی، زمینداروں کو نئے مزارعوں کی ضرورت ہے پرانوں کی جگہ۔"

"شرم نہیں آتی؟" فاطمہ چلا اٹھی۔

مسافر تیورا سا گیا اور میرے جی میں آئی کہ گٹھڑی اٹھا کر فاطمہ کے سر پر دے ماروں، اس نے مسافر کو یوں ڈانٹا تھا جیسے وہ کوئی بچہ ہے، اور اسی کا بچہ ہے، پھر اس نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ بولتی چلی گئی۔" اچھی خاصی سمجھ بوجھ کی باتیں کر رہے تھے تم، اور اب ایسی کمینی باتوں پر اتر آئے!" — میں غصے سے اٹھ کھڑا ہوا مگر وہ بولے چلی گئی۔" میں تو خاک چاٹ لوں گی پر کسی مزار بھائی کا حق

نہیں بتیاؤں گی، ہمیں بھی تو زمینداروں نے نکالا ہے، پھر ہم ایسے دُکھی بنے پھرتے ہیں، اور قسمت کو کوس رہے ہیں اور رو رو دیتے ہیں، تو ہم ان کا کیوں خیال نہ کریں جن کے گھر دندے جلے ہیں، جن کی بیویوں اور بیٹیوں ـــــ " فاطمہ کا گلا رندھ گیا، اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، غصّے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اس لئے اس کے پپوٹوں کے آس پاس اُبھرتی ہوئی نمی بھی سرخ تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے - پھر وہ جیسے ان آنسوؤں کو پی کر بولی " میں تو کہتی ہوں کہ اسے جینا ہے عزّت سے، تو انہی لٹے ہوئے مزارعوں کو جمع کر کے جاگیرداروں سے اپنا حق مانگے نہیں، چھین لے، نوچ لے، جھپٹ لے، اور اگر ایسا ہی دھن کا پکا ہے، اور آسمان سے نئے نئے کھیتوں کے اترنے کا منتظر ہے تو پھر ناک کی سیدھ میں چلتا جائے، میں مرتے دم تک تو اس کا ساتھ دوں گی، اس کے بعد کی خبر خدا جانے ـــــ " اس نے گٹھڑی اپنے سر پہ رکھ لی اور بولی " چلو چلیں " ـــ پھر اس نے دور پگڈنڈی پر حیران کھڑے ہوئے بچے کو پکارا - " چراغ - اے چراغ ! "

مسافر کی ساری تلخی اس نام نے دھو دی، فاطمہ کے تیوروں نے اس کا رنگ فق کر دیا تھا اور جیسے وہ ان ساری کہانیوں کو ایک دم کھو بیٹھا تھا جو اس نے ہم سے مل کر جمع کی تھیں ! ـــ مگر اب تو جیسے بچے کے نام میں اسے ایک اور کہانی مل گئی ـــ " چراغ ! " وہ حیران ہو کر بولا " بچے کا نام چراغ ہے ؟ "

مسافر کی اس معصوم حیرت نے فاطمہ کی تلخی کو بھی جھٹک دیا - وہ ہنسنے لگی اور بولی " دیہاتی نام ہے بھائی، حیران کیوں ہوتے ہو ؟ "

"حیران کہاں ہو رہا ہوں" مسافر بچے کو بکائنوں کے جھنڈ کی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ "میں تو خوش ہوا ہوں، بہت پیارا نام ہے، بڑا با معنی ہے، نئی نسل کے بچوں کے نام ایسے ہی ہونے چاہئیں، خادم اور غلام قسم کے ناموں سے بزدلی اور کمتری پیدا ہوتی ہے، چراغ میں روشنی ہے اور گرمی ہے، اور خوبصورتی ہے، چراغ بڑا پیارا نام ہے" اس نے اداس بچے کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ "اچھا تو تمہارا نام چراغ ہے؟"

بچہ جو اب تک اپنے جذبات کو ہونٹوں کی کپکپی سے سنبھالے ہوئے تھا، رو دیا۔ "وہ ایسی اچھی تتلی تھی، ایسے پیارے پیارے رنگ تھے، سؤر کی بچی ایسی تیز اڑتی تھی، حرامزادی۔"

فاطمہ حسبِ معمول ہنسنے لگی،

میں نے چراغ کو تسلی دیتے ہوئے کہا "دیکھو تو جھیل تک سبزہ ہی سبزہ ہے، ہمیں راستے میں سینکڑوں تتلیاں ملیں گی۔"

مسافر بولا "میں یہ ساری تتلیاں چراغ کے لئے جمع کروں گا ایک پٹاری میں — میں کہانیاں بھی چنتا ہوں اور تتلیاں بھی پکڑتا ہوں — کتنی تتلیاں چاہئیں؟" بچے نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھ لئے تھے اور اپنی سرخ ناک کو مل رہا تھا!

اور جب ہم بکائنوں کے اس جھنڈ سے نکلے تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں اپنا مٹی کا کچا گھروندا چھوڑ رہا ہوں، اس وقت سورج نے جھیل کی سطح پر آگ لگا دی تھی، مغرب کی طرف جھک جانے کی وجہ سے وہ اپنی ساری شعاعیں جھیل

میں انڈیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اور جیسے دن اب صرف جھیل کی چمک ہی سے روشنی حاصل کر رہا تھا، میں سوچنے لگا، یہ مسافر کہاں کا رہنے والا ہے، اس کے ماں باپ بھائی بہن کہاں ہیں! یہ اپنے دوستوں کو کہاں چھوڑ آیا ہے! اور کیا کہانیاں چننے سے اس کی بھوک مر جاتی ہے،

میں نے اسے غور سے دیکھا، وہ فاطمہ کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، اور اس کے کانوں پر بالوں کے سیاہ گچھوں کو دھوپ نے سنہری کر دیا تھا، اور چراغ دونوں ہاتھوں سے اس کے بالوں کو جکڑے ہوئے تھا، اور وہ اس سے کہہ رہا تھا، "تم چراغ ہو، تم روشنی ہو، تم گرمی اور حسن ہو، سمجھے؟ وہ جھیل سے پرے، اس بھوری بھوری دھند سے بھی پرے، ان پہاڑوں سے بھی پرے ایک افق ہے، اسے مستقبل کہتے ہیں، اس مستقبل کو تمہاری روشنی اور تمہاری گرمی اور تمہارے حسن کی ضرورت ہے، وہ تمہاری راہ تک رہا ہے، سمجھے؟ سمجھے چراغ؟"

چراغ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہاں ایسے گاؤں ہیں جہاں کھیتوں میں گیہوں کی بالیں موتیوں سے لدی رہتی ہیں"

"تو کیا لوگ وہاں موتی کھاتے ہیں بے چارے۔" فاطمہ نے پلٹ کر پوچھا اور گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر زور زور سے ہنسنے لگی، اور اس کی سنہری باہوں پر سے ڈھیلی آستینیں سرک کر اس کے کندھوں پر آ گریں، اور مجھے اس نے ایک دم ماضی کے پاتال میں دھکا دے دیا، جہاں وہ گوپھیا میں پتھر

رکھ کر اسے گھماتی تھی تو اس کا سچے سونے کے سے رنگ کا بازو بجلی کی طرح لشکارے مارتا تھا، اور جب وہ گوپھیا کا ایک سرا چھوڑ کر پتھر کو باجرے کے لمبے لمبے پودوں میں ڈبو دیتی تھی، اور رہزن چڑیاں دور دور بکھر جاتی تھیں تو وہ کہتی تھی "جی چاہتا ہے ہر چڑیا کو باجرے کا ایک سٹہ دے دوں اور ان سے کہوں کہ کمبختو، ڈاکے نہ ڈالا کرو، شریف بنو، اور باجرے کے یہ سٹے جواب کے میری باہوں کے برابر لمبے ہیں، کم از کم ایک ایک مہینے کے لئے تو تمہیں کافی ہوں گے" ـــــ اور میں شرارت سے کہتا تھا۔ "چلو ٹھیک ہے، چڑیوں کو تو باجرے کا ایک ایک سٹا دے دیا تم نے، پر بے چارے چڑے!" ـــــ وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جاتی اور اس کی آنکھیں مارے ہنسی کے بھیگ جاتیں، وہ اپنے پیٹ اور پسلیوں کو دباتی اور ہنستی جاتی۔ اس کا رنگ گلابی ہو جاتا اور پھر نیلا پڑنے لگتا اور وہ بڑی مشکل سے کہہ پاتی۔ "اچھا وہ چڑے! وہ سٹنڈے کمبخت، وہ تمہارے ہوتے سوتے!"

اس وقت بھی اس کا بازو مجھے ایک کوندا، ایک شعاع، ایک کرن معلوم ہوا، اور وہ چمکتی ہوئی جھیل کا ایک حصہ معلوم ہونے لگی، جیسے اس جلتی ہوئی جھیل میں سے ایک لہر چھلک کر پگڈنڈی پر آگئی ہے اور اب واپس جھیل کی طرف ہی جارہی ہے۔

وہ پھر بولی۔ "میں تو چراغ کو اس نگری میں کبھی نہ بھیجوں، جہاں گیہوں کی جگہ موتی چبانے کو ملیں۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔

اور مسافر نے پلٹ کر میری طرف یوں دیکھا جیسے میری بیوی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے، اس سے ساری کہانیاں چھین لی ہیں، اس کی ساری تتلیاں مسل ڈالی ہیں۔ میں جواب میں مسکرا دیا تو اس نے گھبرا کر چراغ کو دوسرے کندھے

پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب تو یہ تھا کہ مستقبل میرا یا تمہارا نہیں، چراغ کا ہے، ہم تم تو وقت کے ریلے میں بہتے ہوئے تنکے ہیں، ہوا کے بہاؤ میں گھرے ہوئے کومل کے بچے ہوئے پر ہیں، ہمیں اپنے آپ پر کچھ بھی تو اختیار نہیں، ہم تم سب بے بس ہیں، اب دیکھو، تمہیں جاگیردار نے ان کھیتوں سے نکال دیا ہے جن کی مینڈھوں سے اب تک تمہارے باپ دادا کے خون پسینے کی مہکار اُٹھ رہی ہے، جہاں تمہارے گیت دفن ہیں، اور تمہاری امیدوں کے پنجر بکھرے ہوئے ہیں، اور زمیندار کو تمہیں ان کھیتوں سے نکالنے کا حق اس لئے ہے کہ مغلوں کے زمانے میں اس کے کسی بزرگ نے کسی شکاری شہزادے کی پیاس بجھادی ہوگی، یا انگریز کے زمانے میں اس نے گورنر کی آمد پر گلیوں میں شامیانے بچھاکر دونوں طرف ادھ ننگے مزارعوں کو سلامی کے لئے سجایا ہوگا اور یہ انعام پایا ہوگا، یا اتحاد پارٹی کے زمانے میں قوم سے بغاوت کی ہوگی اور بدلے میں یہ مربعے ملے ہوں گے، یا اب لیگ راج میں اس نے کسی لیڈر کی دعوت پر —"

مسافر نے ٹھٹک کر ایک طرف دیکھا، چراغ کو کندھے پر سے اتار دیا، لپک کر ایک جھاڑی کے پاس گیا اور جھپٹ کر جیسے اس کی کونپلیں نوچ لیں، وہ بچوں کی طرح کودتا ہوا آیا اور چراغ کے پاس آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ "تتلیاں چراغ تتلیاں! اکٹھی دو، سرخ اور سبز، مجھے تو یہ دو کہانیاں لگتی ہیں، دو شعر، دو تصویریں! — یہ لو!"

چراغ مارے خوشی کے پھول رہا تھا، اس کے چہرے پر رنگ آگیا تھا جیسے وہ روزانہ مکھن کھاتا ہے اور شہد پیتا ہے۔

اس وقت فاطمہ کہیں دور دیکھ رہی تھی۔

"چلو چلیں" مسافر نے چراغ کو کندھے پر بٹھا کر مجھ سے کہا۔

"فاطمہ" میں نے فاطمہ کو پکارا، مگر وہ آنکھوں پر ہاتھ کا سایا کئے کہیں دور دیکھ رہی تھی۔

مسافر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ فاطمہ چلائی۔ "دیکھو دیکھو"۔

ہم سب جھیل کی طرف دیکھنے لگے۔

فاطمہ چلاتی رہی۔ "یہ دھمک سی کیسی ہے! یہ کس کی چاپ ہے!"

ہم نے دیکھا کہ جھیل کی سطح پر آگ کو گرد و غبار نے بجھا دیا تھا، اور سورج اس غبار میں تانبے کی پرانی تھالی کی طرح بے رونق اور بے نور تھا، یہ غبار بلند ہو رہا تھا اور قریب آ رہا تھا، اور ساتھ ہی جیسے پگڈنڈی پھیل رہی تھی، دھرتی دھڑک رہی تھی اور غبار میں سے چھنتا ہوا دبا دبا شور واضح ہوتا جاتا تھا، اس غبار میں سے گیت پھوٹ رہے تھے، اور ان کی ڈوبتی ابھرتی گونج سے کم از کم میرے دماغ میں تو لہو ناچنے لگا تھا۔ میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا، وہ جیسے بازو تول کر ان سے شہپروں کا کام لینے لگی۔ چراغ کی مٹھی ڈھیلی ہو گئی تھی، اور تتلیوں کے سرخ اور سبز پر مسافر کی قمیص کے کالروں میں اٹک گئے تھے، مسافر کا منہ کھلا تھا اور چہرہ فق تھا۔

"یہ کون ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جانے کون ہیں!" میں نے جواب دیا۔

"مزارعے ہیں اور کون ہیں۔" فاطمہ مشین کی طرح بولی۔

پھر اچانک وہ اس شدت سے چلائی کہ میں نے آج تک اس کی اتنی

تیز و تند آواز نہیں سنی تھی، "ہماری ہے۔" وہ چلائی —— ایک لمحے کے بعد وہ پھر اسی زور سے چلائی۔ "ہماری ہے" —— اور میں اس سے اس پاگل پن کی وجہ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ ایک بار پھر گرجی "ہماری ہے"۔

گرد و غبار میں سے بلند ہوتا ہؤا شور بالکل واضح ہو گیا۔ ایک آواز آئی۔ "زمین کس کی ہے؟"

اور میں فاطمہ سے مل کر چلایا۔ "ہماری ہے"

اور فاطمہ گٹھڑی کو میری طرف پھینک کر پگڈنڈی پر دیوانوں کی طرح بھاگنے لگی۔ اور میں گٹھڑی کو مسافر کے پاس رکھ کر فاطمہ کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اور چراغ مچل کر مسافر کے کندھے پر سے اترا اور میرے پیچھے بھاگنے لگا۔ "ہماری ہے۔" وہ بھی ہمارے ساتھ چلایا۔

یہ ایک امڈتا ہؤا ہجوم تھا، لوگوں کے ہاتھوں میں کدالیں اور پھاوڑے اور درانتیاں اور کندھوں پر ہل تھے، ان کی آنکھوں میں آگ اور چہروں پر گلاب تھے، وہ جھیل میں سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، جیسے جھیل نے بے قرار ہو کر اپنی طلپاں لہروں کو سیلاب کی صورت میں دھرتی پر انڈیل دیا تھا اور یہ سیلاب جھیل کے سونے کو ساری دھرتی پر پھیلانے کے لئے امڈ پڑا تھا، سب سے آگے عورتیں تھیں، ان کے پیچھے نوجوان تھے، کہیں کہیں بوڑھے بھی نظر آجاتے تھے جو اپنی سفید داڑھیوں کے باوجود جوانوں کی تیز رفتاری کا ساتھ دے رہے تھے، ان کے چہروں اور سینوں پر پسینے کے موتی تھے، اور ٹانگوں پر گرد جم رہی تھی، اور وہ اپنا حق مانگنے کے بجائے چھیننے نکلے تھے، دھرتی کو

آباد کرکے خود اجڑے رہنا انہیں اب قبول نہ تھا، گیہوں کے موتیوں کے ڈھیر تخلیق کرنے کے بعد خود دھول پھانکنے سے وہ اب انکار کر رہے تھے، —— ایک نوجوان گرجتا تھا۔ "زمین کس کی ہے ؟" —— اور سب مل کر اپنے ہل اور درانتیاں اور کھرپے اور کدالیں اوپر اٹھاتے تھے اور یک زبان ہو کر دھاڑتے تھے۔ "ہماری ہے" —— اور جیسے افق تا افق یہ آواز طراروے بھرتی ہوئی پھیل جاتی تھی، اور پھر دھرتی کی طنابیں کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

اور جب فاطمہ اور میں اور چراغ اس ہجوم کے قریب پہنچے تو ان کے نعروں میں زیادہ جوش زیادہ تندی اور زیادہ حدّت آگئی، یہ نعرے ہی ہمارا تعارف تھے، کسانوں نے کسانوں کو پہچان لیا تھا، اور جب فاطمہ عورتوں کے ہجوم میں مل گئی اور میں چھلکتی ہوئی جھجر کو پہلو میں دبائے نوجوانوں میں آگیا، تو ایک گیت شروع ہو چکا تھا، پھر جب یہ گیت ختم ہؤا تو ہم مسافر کے قریب سے گزر رہے تھے۔

وہ پگڈنڈی پر اسی جگہ کھڑا تھا، اس کا چہرہ فق تھا، اس کا منہ کھلا تھا، اس کی قمیص کے کالروں پر تتلیوں کے پر اسی طرح چمٹے ہوئے تھے، اس نے فاطمہ کی گٹھری کو ایک ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا اور جیسے غنودگی میں ہمارے نعروں کے جواب میں اس کے لب بھی ہلتے تھے، پھر جب ہم کافی دور نکل آئے اور مجھے بگائنوں کا جھنڈ بھی نظر آنے لگا تو میں نے پلٹ کر دیکھا، کہ مسافر آہستہ آہستہ چلتا ہؤا ہجوم کے آخری حصّے میں مل گیا ہے۔

اچانک مجھے چراغ کا خیال آیا، اس ہجوم میں اس کے کھلے جانے کے خیال

نے مجھے حواس باختہ کر دیا اور میں لپک کر ہجوم سے باہر آ گیا۔

اور میں نے دیکھا کہ چراغ سب سے آگے، عورتوں سے بھی آگے، بالکل ایک سپاہی کے ٹھاٹ سے اکڑ اکڑ کر چل رہا ہے، اور نعرے کا جواب دیتے ہوئے اپنا بازو اٹھا کر ہوا میں پھیلا دیتا ہے، اور اگرچہ بے شمار تتلیاں اس کے آس پاس منڈلا رہی ہیں، لیکن وہ ڈھول پھلانگتا ہوا بڑھا جا رہا ہے، اور اس قافلے کی رہنمائی کر رہا ہے جو ڈوبتے ہوئے سورج کو پیچھے چھوڑ آیا تھا، اور اس سرمئی جھٹپٹے میں مسلسل آگے بڑھ رہا تھا جس کے آخری سرے پر نئی صبح کی چاندی اور نئے سورج کا سونا اور نئے چیت کے موتی تھے۔

فاطمہ نے شاید میری حواس باختگی کو بھانپ لیا تھا اور جب میں واپس ہجوم میں شامل ہونے لگا تو اس کی بے تحاشہ ہنسی کی آواز آئی، اس آواز میں ایک پراسرار چھناکا تھا، جیسے زنجیریں ٹوٹتی ہیں اور تلواریں ٹکراتی ہیں اور گھنٹیاں بجتی ہیں!

راجے مہاراجے

(اِس افسانے کے مقامات فرضی ہیں لیکن کردار حقیقی ہیں)

لٹکی ہوئی بھوؤں کے پیچھے اُستانی کی آنکھیں چمکیں اور پوپلے منہ میں مُڑے ہوئے ہوئے ہونٹوں نے الگ ہوتے ہوئے چٹکی سی بجادی ——— "کیا تم شریروں نے مجھے اِسی لئے برسوں کی نیند سے جگایا اور مجھے میری گپھا سے اُٹھا لائے کہ مجھ سے مذاق کرو؟ کمبختو! میں تو تمہارے جھگڑے چکانے آئی تھی ——— اب ذرا میرے سامنے تو آئے وہ ماں کا لاڈلا جسے چاند کی سیّاحت سوجھی ہے!" ——— اُستانی کے چہرے کی جھریاں کمانیں بن گئیں اور الفاظ تیروں کی طرح لپکنے اور سنسنانے لگے ——— "کون جانا چاہتا ہے چاند پر؟"

اُستانی اور تینوں لڑکے ننھے ننھے جزیروں پر بکھرے ہوئے تھے، اِن جزیروں کو ندیوں نے ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا، مگر یہ ندیاں اتنی پتلی پتلی

سی تھیں کہ اگر وہ چاہتے تو ایک دوسرے سے بآسانی مصافحہ کر سکتے تھے، اُستانی ان تینوں کے درمیان بھیگی ہوئی گھاس سے اَٹے ہوئے ایک ٹیلے پر بیٹھی تھی، وہ بے حد تھکی ماندی اور نڈھال نڈھال تھی - اور کبھی کبھی ماتھے پر سے پسینہ پونچھنے کے لئے ہاتھ یوں اُٹھاتی تھی جیسے اگر پسینہ ہاتھ اُٹھائے بغیر خشک ہو جاتا تو اُسے بہت خوشی ہوتی ——— "کون جانا چاہتا ہے چاند پر؟" اُس کی آواز میں، بڑھاپے کے باوجود، عجیب طرّاری تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُستانی کے عقب میں کوئی نوجوان عورت بیٹھی ہے - جو بولتی ہے تو اُستانی اپنے ہونٹ ہلا دیتی ہے -

مکّی یوں اُٹھا جیسے وہ اُٹھنے پر مجبور ہو گیا ہے، وہ نہایت ادب سے ممنایا - "جانا تو شاید سب چاہتے ہیں ماں، پر بولا میں تھا، میں چاندی اور چاندنی کی اس نگری کو جانے کے شوق کو دبا نہ سکا، ——— اور پھر میں جا بھی سکتا ہوں۔"

اُستانی چونکی "جا بھی سکتے ہو؟ چاند پر؟ کیسے؟"

خلوف نے اپنے سر کے خشخشی بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "میں بتا دوں ماں؟ انسانوں کی لاشوں کے مینار بنا کر۔"

مکّی غرایا "بکواس مت کرو خلوف!"

اور خلوف بے پروائی سے بولتا چلا گیا "مکّی نے ایک زہر ایجاد کیا ہے ماں، جسے اس نے ڈار کا نام دیا ہے، اور جسے ضرورت مند بڑے شوق سے نگل بھی جاتے ہیں، مگر نگلتے ہی مر جاتے ہیں اور مکّی قتل کے الزام سے بھی بچا رہتا ہے، اب تک یہ زہر اتنے انسانوں نے نگلا ہے کہ اگر مکّی ان کی لاشوں سے ایک مینار

بنا لے تو اُن کی پسلیوں میں پنجے اٹکا کر وہ نہایت آسانی سے چاند پر پہنچ سکتا ہے۔"

"تم بکتے ہو" رکی تڑپ اُٹھا "میں نے راکٹ ایجاد کیا ہے، یہ دیکھو"

اِدھر دِلی، جس کی ٹھوڑی کا گوشت نیچے لٹک آیا تھا، بولا "میں اس کا گواہ ہوں۔"

اُستانی رکی کی طرف متوجہ ہوئی تو خلوت نے بدستور خشخشی بالوں پر ہاتھ پھیر کر درانتی چلنے کی سی آواز پیدا کرتے ہوئے کہا "اور ماں، اس نے ذرّے سے جہنم اگلوا لیا ہے - اور اگر تم نے اِسے چاند پر جانے دیا اور اس کے ڈالر وہاں بھی بٹنے لگے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری زمین کو بیکار سمجھ کر یہ جہنم اسی پر انڈیل دے، یہ رکی بڑا طوطا چشم ہے ماں۔"

اُستانی نے رکی کو کچھ اِس طرح دیکھا کہ وہ راکٹ کو ایک طرف رکھ کر بالکل یتیموں کی طرح بیٹھ گیا - اور لوہے کی ایک گیند کو جھولی میں ڈال کر سر جھکا لیا - اِدھر سے دِلی نے التجا کی "نیا نیا خون ہے ماں، کھلنڈرا ہے - معاف کر دیجیئے گا۔"

"میں تنگ آ چکی ہوں تمہیں معاف کرتے کرتے۔" اُستانی نے ہاتھ جھٹک کر کہا اور جٹاؤں میں کہیں چھپے ہوئے ایک باسی پھول کی سمٹی سکڑی پنکھڑیاں جلے ہوئے کاغذ کے پرزوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر گئیں "میں صدیوں سے دِلی کو معاف کرتی آ رہی ہوں، جو ملکوں ملکوں تاجر بن کر گیا اور شہنشاہ بن بیٹھا، تم لوگوں نے میرے بچوں کی تجارت کی، تم نے دھرتی کے کلیجے سے رس نچوڑ نچوڑ کر اپنے ذرا ذرا سے جزیروں پر چھڑکا اور میں تمہیں معاف کرتی چلی آئی - اور اب رکی چاند پر جانا چاہتا ہے! ـــــ دیکھو رکی - تم نے اور دِلی نے مل کر مجھے

بہت پریشان کر رکھا ہے۔ میرے پوربی بچے تھے بے چارے، پھول کو دیکھتے تھے تو صرف یہی کہتے تھے، کہ یہ خوبصورت ہے یا خوش رنگ ہے۔ بہت تیر مارا تو پھول کی رگیں گن لیں اور انہیں اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے تشبیہہ دینے لگے۔ مگر تم نئے بچے، اللہ توبہ! پھول کو دیکھتے ہو تو اُسے کوٹ دیتے ہو، پیس ڈالتے ہو، چھان لیتے ہو، اس کے سفوف اور عرق کو شیشے کی نلیوں میں ڈال کر اسے گرمی پہنچاتے ہو اور نتیجہ نکالتے ہو کہ اس میں فلاں الابلا کی اتنی مقدار ہے' اور اس الابلا میں فلاں فتنے کے اتنے اجزا ہیں، اور ان اجزا کے فلاں تناسب سے یہ رنگ پیدا ہوتے ہیں اور ——"

"اور اس قسم کے مہلک بم بن سکتے ہیں"۔ خلوف نے سر پر درانتی چلائی۔

اُستانی بگڑ گئی، "تمہیں دخل در معقولات کی بڑی بُری عادت پڑ گئی ہے —— میری قمچی لاؤ کوئی"!

اور ولی بولا۔" وہ تو پچھلی صدی میں تم نے میرے ہاتھوں پر توڑ دی تھی ماں"۔

ہکی زور کا قہقہہ مار کر ہنسا "یہ تو اچھا خاصہ لطیفہ ہو گیا بھئی"!

اُستانی بھی ناگواری سے مسکرانے لگی "سو یہ ہیں تم بدبختوں کی عادتیں، تم نے تو چکرا ڈالا ہے مجھے، میں پوچھتی ہوں آخر تمہیں یہ مین میخ نکالنے سے کیا حاصل ہو گا شریرو، پھول کو پھول کہو، تارے کو تارا، چاند کو چاند ——"

"اور انسان کو انسان" خلوف بولا۔ مگر پھر اُستانی کے غصّے کے مارے دبک گیا۔

"ہاں، یہ ایک معقول بات کہی تم نے"! اُس نے جھک کر خلوف کے سر پر ہاتھ

پھیرا۔ "تم نے یہ اچھی اچھی سی باتیں کب سے سیکھ لیں موٹو؟" پھر وہ سب سے مخاطب ہوئی۔ "تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں باز آئی اس روز روز کی دانتا کلکل سے، اب واپس اپنی گپھا میں جاتی ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے اپنے پوربی بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جو ان دیکھے خدا کو پوجتے ہیں، مگر ان ہونی باتیں نہیں سوچتے۔"

"اور مِکی کے ڈالر نگل نگل کر مر رہے ہیں، اور وِلی کی تہذیب سیکھ سیکھ کر فنافی الذات ہو گئے ہیں، لیکن جن کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں ابھی تمہاری واپسی کی امید کے چراغ نہیں بجھنے پائے ماں۔" خلوف بڑی اداسی سے استانی کو دیکھنے لگا۔

"میرے پوربی بچے!" استانی کی آنکھیں جیسے پتھرانے لگیں۔

"انہیں بھی یہاں بلالوں ماں"۔ مِکی نے چونک کر کہا۔ "ہم چاند پر جائیں گے تو وہ ذرا چوکیداری کرلیں گے ہمارے ایوانوں کی۔"

"اور بدلے میں کیا پائیں گے؟" خلوف کے ہونٹوں پر بڑی خطرناک سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تہذیب، اور کیا؟" وِلی نے اپنی دوہری ٹھوڑی کو ایک انگلی سے تھپتھپا کر کہا۔ "میز پر کھانا کھانے کا ڈھنگ اور سگریٹ پکڑنے کا طریقہ اور ڈالی پیش کرنے کا سلیقہ، بھئی خلوف، تم بھی عجیب اجڈ آدمی ہو۔"

"اور میں چاند پر جاسکتا ہوں ماں۔" مِکی بار بار چاند کی طرف دیکھتا تھا۔

استانی نے جھک کر مِکی کو کان سے پکڑلیا۔ "پر میں پوچھتی ہوں سیاح کے بچے، کہ تجھے ابھی سے چاند کا غم کیوں مارے ڈالتا ہے" ـــــ استانی کی ناک کے بانسے پر پسینے یا آنسو کا ایک موٹا سا قطرہ مہاسے کی طرح جیسے ابھر کر جم گیا تھا۔ "اپنی زمین

اور اپنے بھائیوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہے کہ یہ کیا ہیں، اور کب سے ہیں، اور کیوں ہیں؟"

"نہیں ماں، ہم اچھی طرح نہیں جانتے"۔ تینوں ایک ساتھ بولے۔

اور پھر اِن جزیروں سے دُور دھند میں لپٹے ہوئے، ایک پوربی جزیرے پر سے اَن گنت آوازیں آئیں۔ "ہم بھی نہیں جانتے ہماری بچھڑی ہوئی ماں، ہم تمہارے پرانے پوربی بچے بھی نہیں جانتے"!

اُستانی اور تینوں لڑکے گھبرا کر مشرق میں ایک جزیرے کی طرف مڑے، دُھند چھٹی تو انہوں نے دیکھا کہ کالے کلوٹے لڑکوں کا ایک انبوہ باہیں پھیلائے منہ پھاڑے چلائے جا رہا تھا۔ "ہم بھی نہیں جانتے ماں، کوئی بھی نہیں جانتا، صرف خدا جانتا ہے"۔

اُستانی کی بھوؤں نے لٹک کر اُس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا، اور پھر کچھ دیر کے بعد بھوسیلی جلد اور خاکستری بالوں کے اس پردے کے نیچے سے دو سوتے بہہ نکلے، اور چمکتا ہوا پانی جھریوں کی وادیوں میں بہتا، پوپلے منہ کے کناروں پر ڈیلٹے بناتا ٹھوڑی تک پھیل گیا۔ "قریب آ جاؤ میرے سانولے سلونے بچو"—— اس کی بھرآئی ہوئی آواز میں قرنوں کے دُکھ تھے، اور صدیوں کے پرانے گناہ کا احساس ندامت،—— "قریب آ جاؤ"—— اُس کی آواز طنبورے کے ٹوٹے ہوئے تار کی طرح کانپ رہی تھی۔

بکی زور زور سے ہنسنے لگا، اور وِلی کی طرف پلٹ کر بولا "اگر اِن لوگوں کی ایک فلم بنائی جائے تو کیسا رہے وِلی؟"

"بہت اچھا رہے"۔ وِلی نے رائے ظاہر کی "بڑی سبق آموز فلم، سینز لوییں

لکھ دوں گا، مجھے صدیوں کا تجربہ ہے"۔

اور پھر دُور کے دھندلے جزیرے پر سے آوازیں آئیں۔" ہمارے پاس کشتیاں نہیں ماں، اور ہم میں سے کئی ایک کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں، اور پھر اُدھر ان پچھمی جزیروں میں، جہاں سے تمہاری آواز آ رہی ہے، ایسے لڑکے بستے ہیں جو رنگ اور نسل کی میزان پر آدمیت کو تولتے ہیں اور ہمارا پسینہ پونچھنے کے بہانے ہماری رگوں سے لہو کھینچ لیتے ہیں، اور ہمارے ہاتھوں میں مورچھل تھما کر سمجھتے ہیں انہوں نے ہمارے لہو کی قیمت ادا کر دی —— ہم یہیں سے سُن لیں گے ماں، تمہاری آواز پورب اور پچھم پر سورج کی شعاعوں اور چاند کی کرنوں کی طرح حاوی ہے"۔

"ماں، چاند کس مرکب سے بنا ہے؟" رکی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"چاند پر تیل کے چشمے اور کوئلے کی کانیں اور گندم اور دھان کی کھیتیاں تو ضرور ہوں گی۔ کیوں ماں؟" دِلی نے مؤدبانہ سوال کیا۔

خلوت جھلا اُٹھا۔" لیکن دِلی، یہ چیزیں تو اب بڑا خطرناک روپ دھار چکی ہیں، وہ اِنسان جو بلندی اور پستی کو ہموار کرنے اٹھیں گے، تیل کے چشموں اور کوئلے کی کانوں ہی سے نکلیں گے، اور پھر گندم اور دھان کی کھیتیوں سے وہ درانتیاں اور کھرپے اُٹھائے آگے بڑھیں گے اور پھر جب یوں ہو گا —— جب یوں ہو گا تو ماں، یہ رکی اور دِلی کہاں جائیں گے؟ مجھے ایک بار ان دونوں نے اپنی طرف سے گالی دی تھی، کہ میں افلاس کی کیچڑ میں پلنے والا کینچوا ہوں۔ اور میں نے کہا تھا۔ کہ تم دونوں امارت کے اُپلے پر اُگنے والے اکھوے ہو، اور اُپلے جل جاتے ہیں اور اکھوے مرجھا جاتے ہیں"۔

اُستانی نے پہلے رکی کو اور پھر خلوف کو دیکھ کر کہا۔ "تم تو ایک دوسرے سے بہت دُور جا چکے ہو کمبختو۔"

اور پرے جزیرے پر سے بہت سی آوازیں ایک کورس میں سُنائی دے رہی تھیں ــــــ "اوس کے قطرے میں چاند کا عکس پڑتا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ چاند زمین پر اُتر آیا، چاند قطرے میں قید ہو گیا، لیکن چاند ہو یا قطرہ، ان میں سے کسی کا وجود نہیں، یہ سب نظر کا دھوکا اور تصوّر کا فریب ہے، اصل میں سب کچھ وہی ہے، اور یہ تمام اُسی کی قدرت کے کرشمے ہیں، جو اُس کو پائے گا وہ لاکھوں سورجوں اور کروڑوں چاندوں کا آقا ہو گا۔ جو اُس سے دُور ہو گا وہ یہ بھی نہ جان سکے گا کہ ہر ذرّے میں ایک جہاں ہے، اور ہر جہاں اس وسیع و بسیط کائنات میں ایک ذرّے کی حیثیت رکھتا ہے، اور وسیع و بسیط کائنات کا کوئی کنارا نہیں اور اسی لئے اس کی قوت اور قدرت بیکراں ہے، وہ جو زمینوں میں ہے اور آسمانوں میں ہے، وہ جو ہر جگہ ہے اور کہیں بھی نہیں ہے۔"

اُستانی بے اختیار رونے لگی۔ "یہ بھولے بھالے تو ابھی تک اُسی چکر میں پڑے ہیں۔"

"یوں ہی ہوتا ہے ماں" خلوف بولا۔ "دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ اُن قوموں سے ترقی کی تمام صلاحیتیں چھن گئیں جو کسی کے محکوم ہو گئے، ــــــ یہ ان کا قصور نہیں ماں، یہ ان کے حاکموں کا قصور ہے۔"

رکی بہت دیر سے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ لی اُستانی سے کہہ رہا تھا۔ "ہم نے تو اِن کی طرف مشنری بھیجے تھے، اور بڑے زور سے خداوند

خدا ——"

"سچی بات کیوں نہیں کہتے دِلی" خلوت نے اُسے ٹوکا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے تاجر بھیجے تھے، جو انہی سے کھالیں لیتے تھے، اور ان کی اُجرت اس صورت میں ادا کرتے تھے، کہ انہیں اپنے بوٹوں کو پالش کرنے کی عزت بخشتے تھے، جو—"

"تم بڑی لمبی لمبی باتیں کرنے لگے ہو خلوت"۔ اُستانی نے خلوت کو ٹوکا ——،

اور پرلے جزیرے پر پوربی بچے پوجا میں مصروف تھے، اور چاند ناریل کے جھنڈ میں پھنس کر رہ گیا تھا، اور نرم ہوا سے ڈولتی ہوئی شاخوں نے اس میں پھڑپھڑاہٹ بھر دی تھی، اور ایک فاختہ اِن شاخوں میں چھپی جیسے زخمی ہو کر کراہ رہی تھی!

"ہاں، ہم چاند پر ضرور جائیں گے"—— مِکی نے رونی صورت بنائی، دِلی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اور خلوت اپنے ہاتھوں کو کدال کی طرح ریت میں گاڑ کر بولا۔

"وہاں بھی درانتی اور کدال پہنچے گی بچہ جی"۔

مِکی ریت پر دراز ہو گیا اور ہاتھوں میں ایک گولا اچھالتے ہوئے بولا۔ "دیکھا جائے گا"۔

"دُور اندیش بنو مِکی"۔ دِلی نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔ "پیش بینی سے کام لو، اور دیکھو، گولے کو یوں نہ اچھالو، اس کے پھٹنے کا تجربہ کسی پوربی جزیرے پر ہی بہتر رہے گا، سمجھے؟"

لیکن مِکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سیٹی بجانے لگا، اور پرلے جزیرے سے ایک گونج اُٹھی۔ "تو سب سے بڑا ہے، تو ساری کائنات کا آقا ہے، ہم تیرے غلام ہیں، ہم پر رحمتوں کے پھول برسا"۔

"یہ رحمت کا پیڑ کس ملک میں اُگتا ہے ماں؟" خلوف نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

اُستانی آنسو پونچھ کر مسکرا دی۔ چاند ناریل کے شکنجے میں سے نکل کر ہنسنے لگا۔ ندیوں میں چاندی کی پتریاں سی ناچنے لگیں، اور ایک فاختہ اُستانی کے پاس اُتر کر بھیگی ہوئی گھاس کی جڑیں کریدنے لگی۔

اُستانی سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے نہ جانے کیا سوچنے لگی تھی اور خلوف مٹھیوں میں ریت بھر بھر کر نیچے گرا رہا تھا، کہ اچانک ہکی اپنے جزیرے کے ساحل پر اپنے ہاتھ رکھ کر دِلی کی طرف جھکا۔ اِدھر سے دِلی نے بھی ایسی ہی حرکت کی، دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی سرگوشی کی، اور پھر دونوں ایک ساتھ اپنی اپنی کشتیوں میں اُترے اور پورب کی طرف روانہ ہو گئے۔

دِلی اور ہکی پوربی بچّوں کے انبوہ کو اپنی کشتیوں میں ٹھونس ٹھانس کر لے آئے اور انہیں ایک مخروطی سے دلدلی ٹیلے پر اُتار کر اپنے جزیروں کی طرف چلے گئے، ننگ دھڑنگ بچّے اور نیم عُریاں بچّے اور بیمار بچّے دلدل میں ہاتھ اور پاؤں گاڑ گاڑ کر ٹیلے کی چوٹی پر رینگنے کی کوشش کرنے لگے، اور جب سب اوپر آ گئے تو گدالوں اور پھاوڑوں سے ستر پوشی کی کوشش میں لگ گئے، چند ایک دِلی اور ہکی کو بڑی غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، کئی ایسے بھی تھے جو دِلی اور ہکی کی طرف مارے خوف کے آنکھ تک نہیں اُٹھا سکتے تھے، اُن کے بالوں میں بھوسے کے تنکے اٹکے ہوئے تھے، چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اُن کی کلائیوں میں ہتھکڑیوں نے گانٹھیں ڈال دی تھیں اور بیڑیاں جو گھس گھس کر ٹوٹنے ہی والی تھیں، اُن کے ٹخنوں

اور پنڈلیوں میں جیسے پیوست ہو کر اُن کی رگوں میں بدل چکی تھیں، اور کبھی کبھی بج اُٹھتی تھیں۔

"جاؤ ہتھکڑی اور بیڑی کے چھناکے سے نکلا ہے!" مِکّی نے وِلّی سے عالمانہ انداز میں کہا۔

"تم مجھے سمجھاتے ہو؟ ۔ مجھے؟ ۔ یعنی مجھے؟" وِلّی نے طنزاً مسکرا کر کہا۔

مِکّی نے زور کا قہقہہ لگایا اور آگے جھک کر وِلّی کے ہاتھ پر ہاتھ مارا "معافی چاہتا ہوں اُستاد، یہ سب تمہارا فیضان ہے!"

اور وِلّی اپنی ٹھوڑی کا گوشت نوچنے لگا۔

خلوفے جواب تک حیران کھڑا اپنے سر پر سرد سرد ہاتھ پھیر رہا تھا، نو واردوں سے مخاطب ہوا "تمہارے کپڑے کہاں گئے؟"

وہ حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک پستہ قد لڑکا اچھل کر سامنے آگیا۔ اُس کی کلائیوں اور ٹخنوں پر گانٹھیں تھیں، اور اُس کے گال اُس کی آنکھوں کی طرح اندر دھنسے ہوئے تھے، مگر اُس کے انداز میں بلا کی چستی تھی اور اُس کے ماتھے پر اُجالا سا تھا۔

وِلّی نے مِکّی سے سرگوشی کی "اس نے افیون کھانا چھوڑا ہے کیا؟"

"تمہارے کپڑے کہاں ہیں بچو!" اُستانی اُن کے سروں پر باری باری ہاتھ پھیر کر پوچھ رہی تھی۔

مگر اُس چھوٹے سے طرّار لڑکے کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وِلّی بولا "بات یہ ہے

ماں کہ اُن کے پاس کشتیوں کا کرایہ نہیں تھا، اس لئے ہم نے اِن کے کپڑے اُتار لئے ہیں۔"

"جب یہ کرایہ ادا کردیں گے ناماں ——— سُود سمیت"۔ بکّی نے کہا۔"تو ہم انہیں کپڑے واپس کردیں گے، معمولی بات ہے، نقد سودے کا معاملہ ہے۔"

خلوتؔ نے تیوری چڑھا کر کہا۔"تمہیں شرم آنی چاہیئے۔"

دِلّی بولا۔"اطلاعاً عرض کردوں حضور، کہ سوداگری میں شرم گھاٹے کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔"

"اور ہم نے کشتیاں مفت نہیں بنائیں"۔ بکّی نے طنزاً کہا، اور پھر پوربی بچوں کی طرف پلٹا۔"ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھ جاؤ ورنہ سردی لگ جائے گی، یا پانی میں گر جاؤ گے۔"

خلوتؔ اکڑ کر کھڑا ہوگیا۔"جیسے جی چاہے بیٹھو دوستو! کیونکہ یہ سارے جزیرے تمہارے ہیں، ہم سب کے ہیں، اور ہم سب انسان ہیں، یہاں وہاں جہاں جی چاہے دندناتے پھرو۔ اور یاد رکھو کہ کالے گورے کے امتیاز میں شرارت ہے، اور دِلّی اور بکّی کی عادت میں داخل ہے کہ وہ انسان دے کر گندم اور چاول خریدتے ہیں اور گندم اور چاول دے کر انسان خریدتے ہیں۔ ملک خریدتے اور بیچتے ہیں، تو میں خریدتے اور بیچتے ہیں ——— اور ہماری ——— ہماری اور اپنی ماں کو بھی اُنہوں نے کئی بار خریدا اور بیچا ہے" ——— خلوتؔ کی آواز گرج کی حد تک پہنچ گئی تھی۔

اُستانی نے جھوبے سے کہا۔"خلوتؔ بیٹے! میری خواہش تھی کہ تم آپس میں من جاؤ، میرے اس سفید جھنڈے کا لحاظ کرو اور من جاؤ، پر تم تو بات بات پر اُلجھ

اُلجھ پڑتے ہو، تو کیا میں پھر اسی غار میں اُتر جاؤں جہاں سے تم مجھے اُٹھا لائے تھے؟"

"ماں" ہکی چہکا۔ "تمہاری اجازت ہو تو میں یہ گولہ پھینک کر اس کی ساری شیخی کرکری کر دوں۔"

"ارے پوچھتے کیا ہو، پھینک دو کہ قصہ ہی پاک ہو جائے" دِلی نے سرگوشی کی۔ "تم اتنی جرأت نہیں کر سکتے تو لاؤ مجھے دو۔"

مگر ہکی نے دِلی کو انگوٹھا دکھا دیا، اور اُسے کچھ یوں تکنے لگا جیسے پوچھ رہا ہے۔ "حضور کے مزاج تو اچھے ہیں؟"

اُستانی بولی۔ "تمہارا یہ گولہ بڑا بے قرار نظر آتا ہے ہکی۔"

ہکی نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

اور خلوف، جو شاید اسی موقع کا منتظر تھا۔ بولا۔ "تم اداس نہ ہو ماں، اب تم غار میں کبھی نہیں اترو گی، ہم تمہیں اپنی آنکھوں اور اپنے ذہنوں میں بٹھائیں گے، کیونکہ ہم تمہارے بغیر کچھ بھی تو نہیں ماں، ہم اتنا بھی تو نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس حالت تک کیوں پہنچے ہیں اور یہ سب کچھ کیا ہے۔"

"سنو گے ہکی؟" اُستانی نے پوچھا۔

اور جواب دِلی نے دیا۔ "ضرور سنیں گے ماں۔"

اب اُستانی نے کہانی شروع کی، لیکن بالکل ایسے انداز میں جیسے نیند میں بڑبڑا رہی ہے، اور کوئی بہت پرانی بات یاد کر رہی ہے، فاختہ گھاس کی ایک

پتی چونچ میں اٹھائے اُڑی ، اور ناریل پر جا بیٹھی ۔ ٹیلے سے لے کر درخت تک ایک چمکتی ہوئی لکیر نے اُس کی اڑان کا راستہ معین کیا ، یہ گھاس کی پتی پر لرزتا ہوا اوس کا قطرہ تھا ـــــ نیچے ندیوں میں چاند کی کرنیں لہراتی ہوئی بہتی چلی گئیں ۔

" لاکھوں قرن گزرے "۔ اُستانی کہہ رہی تھی ۔" کروڑوں صدیاں بیتیں کہ ایک سیارہ سورج کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس سے ٹکرا گیا ـــــ "

پوربی بچوں نے اچانک مالائیں اور تسبیحیں گھمانا شروع کر دیں ۔

" اس ٹکر سے سورج کے چند پُرزے اڑ کر فضا میں بکھر گئے ۔ ٹکر کا زور اُنہیں سورج سے پرے دھکیل رہا تھا ۔ اور سورج کی کشش اُنہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی ، اس لئے یہ چھوٹے بڑے ٹکڑے فضا میں لپک کر چکرانے لگے اور سورج کے ارد گرد گھومنے لگے اور گھومتے گھومتے گول مول ہو گئے اور ٹھنڈے پڑ گئے ، اور سیارے کہلائے ، ان میں سے ایک سیارہ چاند اور دوسرا زمین ـــــ "

" وہ مارا ! " رکی اچھل کر چیخا اور پاس پڑے ہوئے راکٹ کو تھپتھپا کر اور گولے کو ہوا میں اُچھال کر چلانے لگا ۔" اس کا مطلب تو یہ ہوا ماں کہ چاند ہماری ہی زمین کا ایک حصہ ہے "۔

خلوف بھی اُسی شدت سے بولا ۔" اور اِسی لئے یہ بھی تمہارے چچا سام کی جاگیر ہے ـــــ ہے نا ؟ کان کھول کر سُن لو بیٹے کہ اگر تم نے چاند پہ جا کر دھا چوکڑی مچائی تو ہم تمہارا جزیرہ چاند سے اُترنے والے مہاجرین کے سپرد کر دیں گے "۔

اُستانی سر کو ہاتھوں میں تھام کر جھک گئی تھی، فاختہ بار بار اڑتی اور ننھے ننھے چکر کاٹ کر کسی شاخ پر بیٹھ جاتی، وِلی اُٹھا اور اپنے بازو پھیلا دیئے، ایک ہاتھ سے رِکی کو اور دوسرے سے خلوف کو شانت رہنے کے اشارے کرتے ہوئے بزرگانہ انداز میں بولا۔ "جنگ بڑی واہیات چیز ہے بھائیو، ویسے میں اپنے پرانے دوست خلوف سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ رِکی نے تو راکٹ ایجاد کیا مگر تمہارے پاس کیا ہے؟"

"نہیں بتاؤں گا۔" خلوف نے غصّے میں کہا۔

"بتا دے یار"۔ وِلی نے بے انتہا مصنوعی مسکراہٹ سے سرگوشی کی۔ "اگر تم ذرا سا بھی غور کرو تو خلوف بھیّا، تمہیں معلوم ہو جائے گا، کہ ہم دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جاہل مورخوں نے ہمیں خواہ مخواہ الگ کر رکھا ہے، اور پھر تم پوربی تو قطعی نہیں ہو، تم تو ہر لحاظ سے، یعنی میرا مطلب ہے جلد کے رنگ اور اندازِ نشست و برخاست وغیرہ کے لحاظ سے صدفی صد اصلی مغربی ہو، میں ہمیشہ تمہارے دشمنوں کا دشمن رہا ہوں، نپولین کو یاد کرو، اور پھر نازیوں کو یاد کرو، جنہیں ہم نے اپنی ماں کا نام اونچا کرنے کے لئے موت کے گھاٹ اتارا اور پھر ان کو جلا کر اُن کی راکھ تک اڑا دی - اور اپنی ماں کا ناموس بچا لیا، تو میں یہ کہہ رہا تھا خلوف بھیّا کہ تم اور میں تو بہت پرانے دوست ہیں، یہ رِکی تو بھگوڑا ہے کمبخت، ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش ہے، چوری چکاری کے الزام میں مَیں نے اپنے جزیرے سے بھگایا اور اب حضور کے دماغ ہی نہیں ملتے! —— تو بات یہ ہے خلوف بھیّا، کہ رِکی کے

پاس تو ہوُا راکٹ - پر تمہارے پاس کیا ہے ؟ مجھے نہیں بتاؤ گے تو اور کسے بتاؤ گے دوست ؟"

"وِلّی" رکی جو اب تک راکٹ کو اپنے رومال سے صاف کر رہا تھا - چیخا۔ "تم دونوں میرے خلاف سازش کر رہے ہو، اور میرے پاس ایٹم بم ہے - سمجھے ؟"

"ایٹم بم ؟" —— پوربی بچوں میں سے ایک، انتہائی دحشت سے چلا کر اُچھلا، اور پھر دھم سے گر کر تڑپنے لگا - اُستانی، جو اب تک رو رہی تھی، یا شائد اونگھ رہی تھی، دلدلی جزیرے پر آگئی، اور بچّے کو گود میں لے کر اور وہیں کیچڑ میں بیٹھ کر ہولے ہولے لوری گانے لگی -

رکی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں ریت پر لیٹ گیا - اور دِلّی نے آہستہ سے کہا - "بھائی جان! —— یہ جاپان ہے!"

"تم مجھے بتا رہے ہو ؟ —— مجھے ؟ —— یعنی مجھے ؟ ——" رکی طنزاً مُسکرایا -

خوفزدہ بچے کو لوری دیتے دیتے اُستانی پر غنودگی طاری ہو گئی تھی، اور وہ بڑبڑا رہی تھی - "پھر میں جگہ جگہ بھٹکتی پھری، بابل اور روم اور مقدونیہ —— میں نگر نگر اپنا ناموس بچانے کے لئے پناہ لیتی پھری اور اس کے بعد"

"ماں، اے ماں" خلوف نے اُستانی کو پکارا - "تم نیند ہی نیند میں بہت آگے نکل گئی ہو" -

"اُستانی نے چونک کر اپنے ٹیلے کی طرف دیکھا - جہاں بھولی بھالی فاختہ

بیٹھی پر سنوار رہی تھی، اور اُس کی چونچ میں گھاس کی ایک پتی تھی جس پر اوس کا قطرہ چمک رہا تھا، اُس وقت چاند مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ اور ناریلوں کے سائے چمکتی ہوئی لہروں پر لیٹ گئے تھے، اُستانی نے خلوفؔ سے پوچھا "تو میں کہاں تک پہنچی تھی؟"

مکی ایک دم پکارا "تم کہہ رہی تھیں ہاں، کہ چاند ہماری ہی زمین کا ایک ٹکڑا ہے"۔

"اور اس لئے اس پر بھی تمہارا اجارہ ہے" خلوفؔ نے طنزاً کہا۔

اُستانی نے ہاتھ جھٹک کر ڈانٹا۔ "کچھ سُنو گے بھی یا اپنی سی ہانکے جاؤ گے؟"

سناٹا چھا گیا۔ صرف پوربی بچوں کے لبوں سے کسی طلسمی جاپ کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی، اور اوپر ناریل کے درختوں کی چھتریوں میں ہوائیں بھونرول کی طرح گونج رہی تھیں اور نیچے ندیوں میں چاند قاش قاش ہو کر بہہ رہا تھا۔ اور فاختہ کہیں فضا میں اُڑتی پھرتی تھی۔ خوفزدہ بچہ آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھا تھا اور خلوفؔ، دِلی، اور مکی آنکھیں جھکائے ہوئے تھے اور منتظر تھے کہ اُستانی کب کہانی شروع کرے،

"شروع شروع میں انسان نے درختوں پر رہائش اختیار کی" اُستانی نے اپنے ٹیلے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"یعنی جب وہ بندر سے ——" مکی نے کہنا چاہا مگر اُستانی کے پلٹ کر دیکھنے سے آواز رُک گئی۔

"اس نے درختوں پر رہائش اختیار کی اور درختوں کی جڑوں اور ناریل کو اپنی

اولین خوراک بنایا۔" اُستانی نے اپنے ٹیلے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ فاختہ اب نیچے اُتر آئی تھی!

"اس نے ہزاروں برس درختوں میں گذار دیئے۔" اُستانی نے اطمینان سے بیٹھ کر کہا۔ مگر اچانک رکی ستی نے اُسے ٹوکا۔

"ماں"۔ رکی نے بڑے ادب سے پوچھا "ماں، اُسے نیچے اُترنے کا خیال کیوں نہ آیا؟"

"نیچے بڑے بڑے خوفناک وحشی جانور تھے اور اژدھے تھے۔" اُستانی نے جواب دیا۔

"اور ماں!" خلوت نے بھی رکی ہی کا لہجہ اختیار کیا۔ "یہ بڑے بڑے خوفناک وحشی جانور اور اژدھے تو آج بھی غریب انسان کی بستیوں کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع پاتے ہی اُنہیں ڈس کر اور چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔"

"آج بھی؟" اُستانی حیران رہ گئی۔ "کہاں؟"

خلوت کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ولی اور رکی اچانک چلّا اٹھے، اور آس پاس بکھرے ہوئے ننھے ننھے پست ٹیلوں پر لیٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے اونگھتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور یک زبان ہو کر چیخنا شروع کر دیا۔ "یہ خلوت ہر بات میں خواہ مخواہ ٹانگ اُڑاتا ہے ماں، کیا اس نے ساری دنیا کے انسانوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ یہ بات بات پر تڑپ اُٹھتا ہے، ہم تو تمہارے تجربہ کار بچے ہیں ماں، ہم نے قوموں کو مٹتے اور اُبھرتے دیکھا ہے، ہم نے تمدّنوں کو پامال ہوتے اور پھولتے پھلتے دیکھا ہے، آج بھی دنیا کے ہر ملک میں اور سمندروں کے ہر جزیرے میں

ہمارے ہی جھنڈے گڑے ہیں، اور یہ خلوف ابھی کل کی پیدائش ہے، یہ کیا جانے تاریخ کا فلسفہ، تم کہانی سنانے جاؤ ماں، اگر خلوف نے اب کوئی گڑبڑ کی تو ہم اسے ندی میں غوطہ دے دیں گے، معلوم ہوتا ہے یہ اُن کالے حبشی بچوں اور پستہ قد پیلے پیلے افیونی لڑکوں کو اپنے آس پاس پاکر چل پڑا ہے، لیکن باور کرو ماں، ہم نے تو اِن چھوکروں کی کھوپڑیوں سے بھیجے نکال کر اپنے عجائب گھروں میں سجا لئے ہیں، حیثیت ہی کیا ہے اِن کمینوں کی، تم کہے چلو ماں۔ ہم تمہارے سعادت مند بچے کان دھر کر سنیں گے، اور جو نہیں سنے گا اُس کی گردن مروڑ ڈالیں گے۔"

اتنی بہت سی باتیں سب نے مل کر کہی تھیں، اس لئے اُستانی کے کچھ پلے نہ پڑا، بس وہ تھکی ہاری سی اپنے سر کو ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی اور دوسرے لٹکے ہوئے ہاتھ سے بھیگی ہوئی گھاس کو نوچے جا رہی تھی، اور جب شور تھما، تو اُس نے سر اٹھایا، اُس کی جھرّیوں میں پھیلے ہوئے آنسو چاندنی میں دمک رہے تھے۔

خلوف، جواب تک بے انتہا ضبط کئے بیٹھا تھا۔ اُٹھا۔ "ماں" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ماں، انہوں نے تمہیں ہمیشہ رلایا ہے، انہی کی وجہ سے تم ہمیں صرف آنسو — صرف آنسو دے سکی ہو، اور ہم تمہاری مُسکراہٹوں کے لئے ترس رہے ہیں، اور تمہارے گجروں کے لئے، اور تمہارے گیتوں کے لئے۔" — پھر اُس کی آواز بلند ہو گئی "ماں، اگر تم اجازت دو تو میں — میں۔"

اُستانی نے لٹکا ہوا ہاتھ اُٹھایا اور خلوف خاموش ہو گیا، اُس وقت پھوریوں میں سے دو چار بچے اُستانی کی طرف باہیں اُٹھائے لسورنے لگے تھے،

چند ایک مالائیں اور تسبیحیں گھمانے میں مصروف تھے، عماموں والے بچوں نے ٹھوکے مار مار کر ایک دوسرے کی پسلیاں دکھا دی تھیں۔

اُستانی اپنے گلے کو مل کر بولی "ہزاروں برس کے بعد انسان نیچے اُترا تو وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ پتھروں کے ہتھیار بنا کر اپنے دشمن درندوں اور اژدہوں کا مقابلہ کر سکے، پتھروں کے آپس میں ٹکرانے سے چنگاریاں جھڑیں تو اُسے آگ کا راز معلوم ہوا، اُس نے ایک دن پانی میں سے مچھلی پکڑی اور جب زمین دوز بھٹی میں دبی ہوئی بھوبھل میں اُسے بھون کر چکھا تو مستقل طور پر پانی کے کنارے آباد ہو گیا۔ پھر وہ ساحل ساحل دُور دُور تک پھیل گیا، پھل اور شکار اُس کی خاص خوراک تھی، لیکن جب آبادی بڑھی اور قدرتی وسائل اُس کی ضرورتوں کا پورا ساتھ نہ دے سکے تو اس نے انسانوں ہی کو بھون بھون کر کھانا شروع کر دیا اور جب سے میں خانہ بدوش ہو گئی۔"

رکی اچھل پڑا "ماں، اگر اس کہانی کے حقوق تم ایک لاکھ ڈالر کے بدلے میرے سپرد کر دو تو میں تمہیں اس زمانے کی ایک ایسی فلم تیار کر دکھاؤں گا کہ تم عش عش کر اٹھو گی۔"

خلوت نے اُستانی کی طرف دیکھا اور پھر جھجک کر بولا "میں مجبور ہو کر بول رہا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو ——"

اُستانی نے مسکرا کر کہا "زیادتی تو نہیں کرو گے نا؟"

"مجھے تو رکی کو اسی سلسلے میں ایک اطلاع دینی ہے" خلوت اب رکی کی طرف پلٹا "تم اُس پرانے زمانے کی فلم کیوں بناتے ہو رکی۔ خواہ مخواہ ماں پہ ایک لاکھ

ڈالر ضائع کر دو گے۔ اسی دودو کی فلم بنالو، جہاں ابھی تک آدم خوری کا رواج زوروں پر ہے۔"

مِکی حسبِ معمول بُرا مان گیا۔" آدم خوری کی رسم اور اس سنہری تہذیب کے دور میں؟ تم اگر میرے ہاں آجاؤ تو میں تمہارے دماغ کا اپریشن کر کے تمہیں تندرست کر دوں گا سمجھے؟ معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے، ارے آدم خوری کی رسم تو اب افریقہ میں بھی ختم ہو رہی ہے پگلے۔ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ تم میرے ہاں کے مؤرخوں کی کتابیں پڑھا کرو۔"

ڈِلی صلح کرانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔" بھئی مِکی۔ تم بہت بدمزاجی سے کام لے رہے ہو، خلوف ٹھیک کہتا ہے، آج بھی تو آسٹریلیا کے پراچین لوگ آدم خوری کے مرض میں مبتلا ہیں، تم چاہو تو میں تمہیں آسٹریلیا جانے کا پرمٹ دے دوں، اپنی نوآبادی ہے۔"

خلوف، جس کے چہرے کے خطوط تنے ہوئے تھے، اور ناریل کی ایک ڈولتی ہوئی شاخ کا سایہ باربار اُس پر تیر تیر جاتا تھا، بولا۔" صرف آسٹریلیا کے پراچین لوگ؟ ارے صاحب خود تمہاری نوآبادیوں اور مِکی کے وطن، اور اُن سرزمینوں میں جہاں یہ اپنے میٹھی میٹھی بھرڈالر پھینک چکا ہے، اور جہاں جہاں تمہاری دولتِ مشترکہ کا سایہ پڑتا ہے، اور جہاں تم دونوں اپنی سنہری تہذیب لے گئے ہو، ان سب مقامات پر آدم خوری بڑے زوروں سے ہو رہی ہے۔ اور چھری کانٹے سے یعنی بڑے مہذب طریقے سے ہو رہی ہے، اور ہاں ــــ ہاں، جانتی ہو یہ اِنسانی بوٹیوں کے کباب بنانے والے اور اِنسانی

ہڈیوں کا گودا چاٹنے والے ہیں کون؟"

اُستانی اپنے کندھے پر بیٹھی ہوئی فاختہ کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی،

"تمہی بتا دو"۔ دِلی نے رائے ظاہر کی۔

اور خلوف دو قدم آگے بڑھ کر بولا "تم اور دِلی اور تمہارے یہ ساتھی جو ننھے ننھے جزیروں سے جونکوں کی طرح چمٹ کر رہ گئے ہیں۔ تم سب آدم خور ہو"

دِلی اور رکی چیختے چلاتے رہے، اور ننھے ننھے جزیروں پر بچے اچھل کر بلبلاتے رہے اور احتجاج کرتے رہے، مگر خلوف گرجتا چلا گیا۔ "تم نے ساری دھرتی پر بسنے والے انسانوں کا گوشت کھسوٹ کر نگل لیا ہے۔ اور اُن کی ہڈیاں توڑ کر اپنے ہتھیاروں کے جڑاؤ دستے بنائے ہیں، تم نے پورب سے تہذیب سیکھی، علم حاصل کیا، تمدن پایا، پورب ہی نے تمہیں مذہب بخشے، اور پھر تم انہی کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر انہی پر جھپٹے، اور تم نے بے چارے ہند کو نوچ نوچ کر بالکل ایک پنجر بنا دیا"

خلوف نے پلٹ کر دیکھا تو گُھس گُھس کر بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے دو لڑکے جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی جلد اپنی ہڈیوں پر منڈھے ہوئے، کھلی کھلی آنکھوں میں سے دھواں چھوڑتے اُٹھے اور اُستانی کی طرف جانے کی کوشش میں کنارے پر لڑکھڑا کر گر پڑے اور کراہے، "ماں ـــ ماں" ـــ اُستانی کے کندھے پر بیٹھی ہوئی فاختہ نے جھک کر اِن عجیب سے کیڑوں کو دیکھا، جن کی آنکھوں میں قندیلیں جل رہی تھیں، اور انگلیوں میں تسبیح کھنچا رہتا اوس کا موتی گھاس کی پتی کی نوک تک لڑھک کر تھرتھرا اُٹھا۔

خلوف کی آواز میں تیزی آگئی "تم نے چین کے کھیت اجاڑ دیئے اور شنگھائی اور ہانگ کانگ کی رقص گاہوں میں —— اپنی اِن دکانوں میں —— چینیوں کی کھوپڑیاں بجا بجا کر ناچتے رہے۔"

اب ایک اور لڑکا اٹھا، یہ وہی پستہ قد طرار لڑکا تھا۔ دِلّی اور مِکّی کو دیکھ کر اُس نے بڑی معنی خیز تیوری چڑھائی اور کسی روحانی کرب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے پاکستان و ہند کے قریب بیٹھ کر اُستانی کو بے انتہا محبت سے دیکھنے لگا۔

دِلّی چلایا۔ "اس کے پاس تو چھرا ہے ماں"

مِکّی چیخا "ماں۔ اِسے ندی میں پھینک دو، اس نے میرا منہ چڑایا ہے۔ اس نے مجھے بھی چھرا دکھایا ہے۔"

اور مسکراتے ہوئے طرار لڑکے نے اُستانی سے کہا۔ "یہ تو صرف ایک درانتی ہے ماں۔ جب مجھے تمہاری آواز سنائی دی، تو میں اپنے کھیتوں میں تھا۔ اور خاردار جھاڑیوں اور صدیوں کی بیکار روئیدگی کو کاٹ کاٹ کر پھینک رہا تھا۔"

"اور پھر" خلوف بدستور بولے جا رہا تھا۔ "تم نے دنیا کے ہر جزیرے میں پہنچ کر وہاں کے بچوں کو نیزوں میں پرو دیا اور اُنہی کی چربی سے بھڑکے ہوئے الاؤ میں اُنہیں گھما گھما کر بھونا۔ اور چبایا۔"

دِلّی آپے سے باہر ہو گیا۔ "مگر ہم نے ایمانداری سے کام لیا۔ اور اُن پر جو نمک مرچ لگا اُس کی قیمت ادا کر دی۔"

لڑکوں کے ایک انبوہ نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر سب کراہ کر بیٹھ گئے،

اُن کی مالائیں اور تسبیحیں منکا منکا ہو کر بکھر گئیں اور فاختہ اُن پر نرم نرم اُڑانیں کرنے لگی۔

خلوت نے تقریر جاری رکھی "اور تم نے ان بستیوں کو بھی تو نہ چھوڑا، جہاں سے تمہیں زندگی ملی، بصیرت ملی، جہاں سے تمہیں اپنی پیاری ماں ملی، جہاں سے تم نے آسمانوں پر کمندیں ڈالنا اور زمین کے پاتال میں گھومنا سیکھا، جہاں سے تم نے سیاروں کی رفتاریں۔ اور ستاروں کے مقامات معلوم کئے، جہاں سے تم نے محرابوں کے خم اور گنبدوں کے دائرے حاصل کئے، جنھوں نے تمہیں محلوں کی فصیلوں پہ عرش کی سی برجیوں اور کنگوروں کی ترتیب سمجھائی، جن سے تم نے اطلس و دیبا کے ملبوس پہننا سیکھے، اور پھر جہاں کی زمینوں سے تیل کھینچنے کے لالچ میں تم نے وہاں کے بچوں کے ذہنوں کو بھی خشک چیتھڑے بنا ڈالا۔

—— اور جہاں ——"

اور عمامے باندھے ہوئے چند بچوں نے، جن کے باقی جسم پر دھجیاں لٹک رہی تھیں، خلوت کو ٹوک دیا۔ وہ ایک دوسرے کو ٹھوکے مارتے، سب سے آگے ہونے کی کوشش میں ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، ایک دوسرے کو پچھاڑتے لتاڑتے، ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے اُٹھے، مگر اُن کی تسبیحیں تیل میں سنی ہوئی تھیں، اور اُن کی دھجی دھجی عباؤں پر تیل کے داغ تھے، اور ان کے عمامے کئی جگہ سے جلے اور نچے ہوئے تھے۔

اُستانی نے گھبرا کر اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا، دو تین بار سر کو جھٹکا۔ اور پھر خلوت کو دیکھنے لگی جو کہہ رہا تھا۔ "یہ اور دوسرے کئی بچے، تمہارے اپنے

جزیروں پر رہنے والے، مشرق و مغرب کے یہ مظلوم —— تم نے ان سب کے جیتے جاگتے جسموں کو کاٹ کاٹ کر کھایا ہے، تم نے اِن سب کا لہو پیا ہے، تم اپنے ضیافت خانوں میں کیوں نہیں جھانکتے جہاں تمہیں سونے اور چاندی کی طشتریوں میں ان کی آنکھیں، ان کی زبانیں، ان کی چھاتیاں اور ان کی رانیں انہی کی ہڈیوں کے گودے میں لپٹی ہوئی ملیں گی، تم اپنی ہی زندگی کی تصویر اتار لو، تو آدم خوروں کے بارے میں ایک نہائیت کامیاب فلم تیار کرنے کے اعزاز میں تمہارا مؤرخ تمہیں بڑا ممتاز مقام بخش دے گا اور تم جاسوسی اور قتل اور جرم کی جو بے شمار فلمیں بناتے ہو اُن میں اتنا عظیم اضافہ کر دو گے کہ اگر ہٹلر زندہ ہوتا تو تمہارا سینہ تمغوں سے لیپ دیتا۔"

خلوف یہ کہہ کر پیچھے ہٹ آیا، اس وقت رکی اپنے جزیرے کے کنارے بہت غضبناک ہو کر کھڑا تھا، اور ولی بھی بار بار اُس کی شہ پر آستینیں چڑھا چڑھا کر خلوف کو گھورتا تھا، مگر کی کی آنکھ بچا کر مسکرا بھی دیتا تھا۔ اور پوربی بچوں کے چہروں پر کندنی سا لوز پھیل رہا تھا۔ ہوا کا ایک بیحد چنچل جھونکا کہیں دور کے پانیوں میں بھیگ کر مچلتا ہوا آیا اور ناریل کی شاخوں میں لہک کر اور نیچے پوربی بچوں کے بالوں اور تار تار لباسوں میں سے گذر کر اُستانی کے آس پاس منڈلانے لگا، اور اُستانی جیسے اچانک چاق و چوبند ہو کر تن گئی، اور فاختہ جھونکے کے اِس دائرے میں تنکے کی طرح بہتی رہی۔ اور گھاس کی پتی پر اوس کا موتی دمکتا رہا، نیچے ندی میں جیسے کسی نے منقش کی مٹھیاں چھڑک دی تھیں، اور بہت دور سے —— اتنی دور سے کہ "بہت" کا لفظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہاریک باریک تانبے

کی کنٹوریوں کی سی آوازیں کوئی عجیب آسمانی سا گیت اپنی لہروں پر بٹھا کر آ رہی تھیں۔ اور چاند جو مغرب کی طرف کچھ اس طرح جھک گیا تھا جیسے ابھی لڑھک کر دھند کے انبار میں غرق ہو جائے گا، اچانک ضرورت سے زیادہ روشن ہو گیا۔ اور اس روشنی میں پکی اور ولی اور خلوف اور دوسرے بچوں کو اُستانی بڑی بدلی بدلی سی لگی، اور فاختہ کی چونچ میں اٹکی ہوئی گھاس کی پتی پر اوس کا قطرہ گرنے ہی نہیں پاتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد اُستانی نے ولی اور پکی کی طرف دیکھا تو ہر طرف بکھرے ہوئے ننھے جزیروں پر بالشت بالشت بھر کے بچے کچھ یوں چمٹ کر رہ گئے کہ دکھائی ہی نہیں دیتے تھے، اُستانی نے کہا "تم بڑے نیک بن کر اور سینے پر صلیبوں کے نشان بنا کر مجھے لینے آئے تھے نا خلفو، اب تمہارے کرتوت سُن سُن کر میرا کلیجہ پھر سے پک گیا ہے۔"

"ابھی کہاں ماں؟" خلوف ابھی تک تازہ دم تھا۔ "ابھی تو یہ چاند پر جائیں گے اور پھر مریخ و مشتری کی خبر لیں گے، اور روز بروز تم سے مُند ہی دُور ہوتے جائیں گے۔ — لیکن نہیں ماں، میں غلط کہہ رہا ہوں، خود انہی کے جزیروں پر ایسے بچے بھی ہیں، جن کو انہوں نے برسوں سے رسّوں میں باندھ کر زمین کے ساتھ ہموار کر رکھا ہے، اِن کو ایک روز اُٹھنا ہے، جس طرح میں اُٹھا تھا نا۔ بالکل اسی طرح اُٹھنا ہے، اور اِدھر سے تمہارے اِن کالے پیلے بچوں کو چونکنا ہے، اور وہاں سے تمہارے عماموں والے نونہالوں کو ایک دوسرے پر جھپٹنے کے بجائے یکجہتی سے قدم اُٹھانا ہیں — اور پھر جب یوں ہو گا نا — تو تمہارا

کلیجہ ٹھنڈا ہوگا، اُس وقت چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی اور ندیوں کے دھیمے دھیمے گیتوں اور ہواؤں کی تھرکنوں اور فاختاؤں کے اُڑانوں کی دنیا میں انسان صرف مُسکرائے گا —— صرف مُسکرائے گا —— اور لمبی لمبی چمنیوں سے صرف دھواں نکلے گا، انسان تحلیل ہو کر نہیں اڑیں گے، اور بِلّی اور کِٹی کے ملبوس کے لئے انسانی گوشت کے ریشوں کی تجارت نہیں ہوگی۔ اور وہ کروڑوں مظلوموں کے بجے ہوئے خون سے چاکلیٹ نہیں بنا سکیں گے"!

"اُف" کِٹی نے اس زور سے ناک چڑھائی کہ وہ اس کی بھووں کے عین وسط میں لال حقندہ بن کر جم گئی۔ "ماں" اُس نے فریاد کی "یہ خلوف جو ہے نا —— مجھے اس کی باتوں سے متلی ہو رہی ہے۔ اِنسانی گوشت کے ریشے اور جما ہوا خون اور ہڈیوں کے گودے اور —— اُف اجی مالش کر رہا ہے ماں، —— یہ بڑا اجڈ ہے کمبخت، یہ تمہاری دھرتی کے حُسن کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے مزدور کہیں کا۔ اچھا بھلا ہمارے ساتھ قدم قدم چل رہا تھا آج سے چند برس پہلے، مگر اب تو یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ جب سبز ریشم کے لچھوں ایسی بیلیں ہمارے دریچوں کے آس پاس طلسماتی تانے بانے سجاتی ہیں اور ہمارے ایوانوں کی کھڑکیوں کے شیشوں پر لوٹتی ہیں اور انہیں چوم چوم کر جھومتی ہیں۔ اور ماں، جب ان میں ایسے پھول اُگتے ہیں جو صبح کو گلابی ہوتے ہیں تو وہ پہر کو اودے ہو جاتے ہیں اور شام کو عنابی۔ اور جب گرمیوں کا ابھرتا ہوا سورج میرے بنگلوں کے حاشیوں پر اُگے ہوئے لمبے لمبے لچکیلے اور سبک درختوں کے سائے سُرخ بجری کی روشوں اور فراخ برآمدوں کے مرمریں فرش پر اُنڈیل دیتا ہے۔ اور جب

آئینہ وش میزوں پر پڑی ہوئی شیشے کی طویل اور چکی ہوئی بوتلوں میں ناچتی ہوئی شمپین ہر آنے والے کو اپنے اندر ڈبو لیتی ہے، اور پھر بڑے غرور سے دوسروں کا انتظار کرتی ہے، اور ماں —— جب لمبوتری اور نکیلی، بالکل سڑک سے لگی ہوئی کاریں فیتے کی طرح بچھی ہوئی سڑکوں پر فراٹے بھرتی ہوئی تیرتی ہیں، اور آس پاس کے درختوں کی جھکی ہوئی نودمیدہ کونپلوں کے رس پر منڈلاتے ہوئے سرخ اور زرد اور سبز رنگ کے بھونرے، ان کا پیچھا کرتے ہیں، اور ماں —— میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ جب ساحل سمندر پر سونے اور چاندی کے ملے جلے ذرات سے بنی ہوئی ریت میں ریشم کی شمسیاں گاڑ کر ہم دھوپ اور سائے میں نہاتے ہیں اور پھر سمندر کی سبز تہوں پر جاکر گھونگے اور سیپیاں چن لاتے ہیں اور جب —— —— اُف ماں، اجازت ہو تو میں ایک سگار پی لوں"

دلی جو آنکھیں بند کر کے جھوم رہا تھا۔ رکی کے خاموش ہوتے ہی بولا "اور ماں، جب میرے شہروں کے گھرے کہرے کو چیرتی ہوئی شعاعیں معبدوں کے کلسوں کو چومتی ہیں، اور پارکوں میں ایک دم لاکھوں کلیاں چٹک جاتی ہیں اور جب بازاروں میں سے ہز میجسٹی کی سواری گزرتی ہے تو ماں —— "

خلوت بیچ میں ٹپک پڑا۔ "اور جب رکی اور دلی کے شہروں کے مضافات میں مائیں اپنے بچوں کو پیٹ میں لئے مرجاتی ہیں، اور جب لڑکے نمونیہ کے درد سے بلبلاتے ہیں، اور جب دن بھر کے تھکے ہارے محنت کش اپنی بیمار ماؤں اور بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کے پاس راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں، اور سوکھی ہوئی روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو بھگو کر چوستے ہیں، اور

ماں - جب اخلاق کی آڑ میں بد اخلاقی اور مذہب کی آڑ میں استحصال اور امن کی آڑ میں جنگ اور ڈالر اور سٹرلنگ کی آڑ میں آدم خوری کو جائز قرار دے دیا جاتا ہے اور جب ان جزیروں کے معملوں میں تمہاری تکا بوٹی کرنے کی تجویزیں بڑے کروفر سے تیار کی جاتی ہیں، اور جب ان تہذیب گاہوں میں کروڑوں اربوں تہذیب سیکھنے والوں کے ڈھانچے، ہرنوں اور بارہ سنگھوں، چیتوں اور شیروں کے سروں کی طرح آرائش کے طور پہ لٹکائے ہوئے جاتے ہیں، اور جب ان کے جہاز عطر اور غازے سے لد کر جاتے ہیں اور لہو کے کنستر اور کھوپڑیوں کی پیٹیاں بھر کر واپس آتے ہیں، جب یہ سب کچھ ہوتا ہے ناماں - تو دنیا بڑی حسین ہو جاتی ہے، اور میں واقعی بڑا بدذوق ہوں کہ میں، مزدور کہیں کا، اسی حسن کو خاک میں ملانے نکلا ہوں ——— تم ٹھیک کہتے ہو مکی - میں اپنے جرم کا اقبالی ہوں"

خلوتؔ نے بات ختم کی اور مکیؔ اور ولیؔ کی طرف دیکھا تو وہ مورچے کھود کر حملے کا انداز اختیار کر چکے تھے، اور استانی نے ٹیلے پر سے گھاس نوچ نوچ کر ایک ڈھیر سا لگا دیا تھا، پوربی بچے اپنے گھٹنوں کے اردگرد باہوں کے حلقے ڈالے یہ سب کچھ دم بخود ہو کر دیکھ رہے تھے، اور کہنیوں اور گھٹنوں پر سے رستے ہوئے خون کو پسینے کی طرح پونچھ کر کبھی استانی کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی خلوتؔ اور مکیؔ اور ولیؔ کی طرف، پھر وہ چونک کر ٹوٹی ہوئی مالاؤں اور تسبیحوں کے منکے چننے لگتے - اور ہر منکے کو چوم کر اور آنکھوں اور ماتھے سے لگا کر سامنے دیکھنے لگتے، اور ناریل کی ایک شاخ پہ

بیٹھی ہوئی فاختہ کی چونچ میں گھاس کی پتی پر لرزتا ہوا اوس کا موتی، چاند کی کرنوں میں شرارے کی طرح چمک رہا تھا۔

"ماں" خلوت چیخا۔ "بکی اور دِلی نے تو مورچے ——"

اُستانی نے چونک کر پچھم کی طرف دیکھا۔ بکی اور دِلی مورچوں سے اچھل کر باہر آگئے، اور بڑے سعادت مندانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔ "ماں، ہم کہانی سنیں گے۔ ہم اب قطعی نہیں بولیں گے۔"

"تم نہیں بولو گے تو میں بھی نہیں بولوں گا" خلوت نے کہا۔

اور اُستانی بچی ہوئی گھاس کو ندی میں گراتے ہوئے بولی "چاند نیچے ہی نیچے بہا جا رہا ہے، وقت کم ہے، میں تیزی سے بولوں گی اور جلدی سے ختم کر دوں گی، اور پھر میں اپنی گپھا میں چلی جاؤں گی اور وہاں سے نہیں نکلوں گی، جب تک مشرق و مغرب کے سب بچے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر میرے پاس نہیں آئیں گے۔"

"ادھر کئی لڑکوں کے ہاتھوں سے پیپ بہہ رہی ہے ماں"۔ بکی نے پورب کی طرف اشارہ کیا، اور پھر اچانک سہم گیا۔ "میں معافی چاہتا ہوں ماں"۔

اُستانی آنکھیں مل کر بولی۔ "تو مطلب یہ ہوا کہ میں کہانی کہہ کر ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں یہاں سے، —— میں کہہ رہی تھی کہ انسان نے اس کے بعد تیر کمان ایجاد کئے، مٹی کے برتن بنائے، پتھر کی کلہاڑیوں اور آگ کی مدد سے کشتیاں بنائیں، اور ساحل ساحل گھومنے لگا، اس کے بعد اُس نے کھیتی باڑی کرنا سیکھا، پورب میں اناج پیدا ہونے لگا، پورب میں دودھ

پیا جانے لگا۔ پورب میں گاؤں بسنے لگے۔ اور پچھم والے اُسی طرح خانہ بدوش رہے، اُنہیں دودھ دینے والا صرف ایک جانور لیا مل سکا، میں سمجھتی ہوں کہ پورب کی پرانی سامی اور آریا نسلیں اُس زمانے کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ نسلیں تھیں۔"

پستہ قد طرار لڑکا، جس نے کہیں درانتی چھپا رکھی تھی، اُٹھ کر اچانک بولنے لگا۔" اور یہی پورب آج ہکی اور دلی کی تجربہ گاہ کیوں ہے ماں؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ لوگ اِسی تہذیب کا آج مذاق کیوں اڑاتے ہیں اور یہاں کے بچوں کے سوا اُنہیں توپوں کا ایندھن اور کہیں کیوں نہیں ملتا؟ ماں، کیا میں یہ بھی پوچھ سکتا ہوں کہ ایٹم بم کا تجربہ پورب والوں پہ کیوں ہوا؟ کیا پچھم میں ہکی کا کوئی دشمن نہ تھا۔ اور کیا پورب کے وہ ہزاروں بچے، جو ایٹم کے جہنم میں جل کر راکھ ہو گئے، اسی لئے پروان چڑھائے گئے تھے کہ ہکی اِن پر اپنی وحشت اور بربریت کا ایک گُر آزمائے؟

میں تو خیر ہکی اور دلی کی خبر لے لوں گا ماں، — لیکن میرے دوسرے بھائی، — آخر کب تک — آخر کب تک ماں؟"

"ماں — ماں!" پورب کے سب بچوں نے فریاد کی۔

"تمہیں بولنے کی اجازت کس نے دی تھی؟" ہکی نے طرار لڑکے سے پوچھا اور گولا اچھالا۔

"اور تمہیں کس نے اجازت دی تھی؟" لڑکے نے درانتی نکالی۔

"تہذیب سیکھو" دلی نے طرار لڑکے کو ڈپٹ کر کہا" صدیوں سے مغز

کھپا رہا ہوں تمہارے ساتھ۔"

لڑکے نے ایک قہقہہ لگایا۔ سب ادھ ننگے بچے مسکرانے لگے، اور دلی آستینیں چڑھانے لگا۔

"پھر کیا ہوا ماں؟" خلوف نے موقعہ غنیمت جانا۔

"پھر جب گاؤں آباد ہونے لگے" اُستانی بھی جیسے منتظر بیٹھی تھی، تیزی سے بولنے لگی۔ "اور آبادی بڑھی تو کھیتی باڑی کے لئے زیادہ زمینوں کی ضرورت ہوئی، مگر ہر طرف گھنے جنگل پھیلے ہوئے تھے، سو لوہا ڈھونڈ نکالا گیا، جس سے کلہاڑیاں بنیں اور جنگل صاف ہونے لگے، ہل کی پھالیں ڈھلیں اور ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگے، تلواریں بنائی گئیں اور —— تو میں کہہ رہی تھی کہ جب انسان نے اکٹھا رہنا سیکھا اور اُس کی ملکیت بڑھنے لگی، تو وہ قبیلوں میں بٹ گیا، پھر قبیلوں کے سردار چُنے گئے، اور جب آہستہ آہستہ گاؤں پھیل کر شہر بن گئے، اور سردار پھول کر بادشاہ بن گئے، تو شراہیں کشید کی گئیں۔ عورتیں بیچی جانے لگیں، جہاز تیار ہوئے، عمارتیں تعمیر ہوئیں، اور وہ تہذیبیں اُبھریں جن سے تمہاری باقاعدہ تاریخ شروع ہوتی ہے، یعنی جب اس کے بعد لوہا اتنا عام ہو گیا کہ اس سے توپیں ڈھلیں اور کارخانے تیار ہوئے اور سارے ملک کی دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹ آئی، اور بادشاہ صرف دستار کے طرے یا ٹوپی کے پھول کی حیثیت اختیار کر گئے، اور آخر کار ہیروشیما میں انسانی تہذیب —— میری تہذیب —— میری دھرتی کی ——" اُستانی کا گلا بھر آیا۔

روتے روتے اُس کی گھگھی بندھ گئی، رندھے ہوئے گلے سے بھیگی بیٹھی

بیٹھی آواز نکلی "چاند لڑھکا جارہا ہے بچو، مجھے جانا چاہیئے"۔

"نہیں ماں" خلوت اور پوربی نیچے اور اس کے بعد ہکی اور رولی بھی چلّا اُٹھے۔ اور ایک ثانیئے کے سنّاٹے کے بعد بہت دُور —— بہت ہی دُور سے ہوا کا ایک جھونکا "نہیں ماں —— ابھی نہیں ماں" کی اَن گنت آوازیں اُٹھا کر لایا۔ اور ان جزیروں پر بکھیر کر آگے نکل گیا، اور فاختہ کی چونچ میں اٹکی ہوئی گھاس کی پتی پر اوس کا قطرہ گرتے گرتے بچا، اور پھر اس کے بعد جیسے کروڑوں میل دُور سے ایک تھکا ماندہ جھونکا آیا اور تانبے کی ننھی ننھی کٹوریوں کی سی آوازوں میں گائے ہوئے گیتوں کی لڑیاں ذہنوں میں جھنجھناتی چھوڑ کر جیسے کہیں سو گیا، کھو سا گیا، اور پھر ہر طرف ایک ایسا سنّاٹا چھا گیا جس میں ذرہ ذرہ سنسنانے لگتا ہے، بالکل گرمیوں کی دوپہروں والا سنّاٹا، مگر کتنا خنک اور لطیف —— اُستانی کچھ سوچنے لگی تھی۔

سب بچے اُستانی کے آخری فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ جھکے ہوئے چاند نے ناریلوں کے سایوں کے آخری سرے دُور دھند تک پھیلا دیئے تھے۔

آخر خلوت سے نہ رہا گیا۔ "یہ کیا بات ہے ماں، کہ انسان نے جس قدر ترقی کی ہے، اُسی قدر مہلک ہتھیار ایجاد کیئے، پھر آگے بڑھا تو تلوار ڈھالی، پھر توپیں بنائیں۔ اور اب اُس نے زہر اور جراثیم پھیلانے والی گیسیں اور ایٹم بم ایجاد کیا ہے۔ کیا یہی وہ سنہری تہذیب ہے ماں جس کے رولی اور ہکی قصیدے پڑھ رہے ہیں؟ —— تو پھر اگر یہ چند راجے مہاراجے اور ترقی کریں گے ماں، تو کیا ایک ایسا ہتھیار ایجاد نہیں کریں گے جس سے یہ دھرتی جھنجھ اور تڑخ

کر پرزے پرزے ہو جائے اور اس کے ٹکڑے خلاؤں میں بکھر جائیں —— کیا انسانی تہذیب کا عروج یہی ہے ماں یا —— "

" میں خود سوچ رہی ہوں خلوف " اُستانی نے سر اُٹھا کر کہا ۔ " میں خود اس بات پر غور کر رہی ہوں کہ اب آگے کیا ہو گا "

" یوں کریں ماں " رکی بولا " کہ میں ذرا پہلے چاند کو دیکھ آؤں ، اگر رہن سہن کے لائق ہوا تو میں تمہارے سب بچوں کو یعنی خلوف دلوف کو چاند پر چھوڑ آؤں گا ، اور پھر واپس آ کر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گا ماں اور —— "

" جی نہیں " خلوف خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا ۔

" اور میں رکی ؟ " دِلی نے فریاد کی ۔

" چاند پر تو وہی جا کے بسیں گے جنہیں یہاں ٹھکانا نہیں ملتا " خلوف بولا ۔

" اور درست ، اب تو یہ ساری دھرتی سارے انسانوں کی ہے ، اُن کی جن کو تم نے برسوں سے پچھاڑ رکھا ہے ، اور اُن کی جن کے بھیجے تم نے اپنے عجائب گھروں میں سجا رکھے ہیں "

اور اچانک فاختہ نے ہر طرف چکر لگانا شروع کر دیے اور اس کی چونچ کے قریب چمکتا ہوا موتی کا دانہ تیز اڑانوں کی زد میں آ کر سنہری دائرے بننے لگا ، اور یہ دائرے اُستانی کے چہرے پر ہالے بن کر جیسے جم کے جم رہ گئے ، اور اُدھر رکی اور دِلی سیٹیاں بجا بجا کر فاختہ کو اپنی طرف بلانے لگے ۔

پوربی بچے مسکراتے ہوئے تن کر کھڑے ہو گئے اور خلوف بولے چلا گیا ۔

" اور ماں - اب تم مایوس ہو کر گپھا کا رُخ کیوں کرتی ہو ؟ اب تو چاند لڑھک کر

بہت دُور جا چکا ہے، اور پورب کے دھندلکوں تلے دبی ہوئی پو دھڑک رہی ہے، ابھی شعاعوں کی پچکاری چھوٹے گی اور پھر تم دیکھو گی کہ ہم کالے گورے، نیلے پیلے انسان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تمہارے اردگرد رقص کر رہے ہیں، اور ہکّی اور ڈِلی بھی ہم میں شامل ہیں اور ہماری ساری دھرتی پر نیکی ہے اور خوبصورتی ہے اور مسکراہٹ ہے ——"

"مجھے تو معاف ہی رکھیئے نجومی صاحب" ہکّی نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ "ان عماموں اور دھوتیوں اور لنگوٹیوں کے ساتھ مل کر رقص کرنا میرے "وے آف لائف" کے خلاف ہے، یہ تمہی کو مبارک ہو۔"

اُستانی مایوس ہو کر اُٹھی "کوئی مجھے گپھا تک پہنچانے آئے گا یا میں اکیلی چلی جاؤں؟"

اور پھر بے قرار فاختہ کوکو چلا اُٹھی، اور گھاس کی پتی ہوا میں کروٹیں بدلنے لگی اور اداس کا موتی پوربی ٹاپو میں گر پڑا، لہروں کا ایک پربت گرجتا ہوا، اُبھرا اور پورب کی طرف برق رفتاری سے لڑھکتا چلا گیا۔ ایک دھماکے کے ساتھ پو پھٹی، اور مغرب و مشرق اور جنوب و شمال سے بھاری بھاری آوازیں بلند ہوئیں۔

"نہ جاؤ ماں —— نہ جاؤ —— نہ جاؤ۔"

اُستانی سرو قد کھڑی ہو گئی، اور بہت دُور نظریں جما کر چار طرف گھوم گئی، خلوص اور اداس کے ساتھ پورب کے سب بچے اکڑ کر کھڑے ہو گئے جیسے کنواری پو کو سلامی دے رہے ہیں۔ ہکّی کے جزیرے پر ایک خوفناک شور بلند ہوا۔ ہکّی پلٹا تو لوہے میں ڈھلے ہوئے ہاتھ جن کے ساتھ ٹوٹی ہوئی رسیوں کے ٹکڑے لٹک

رہے تھے۔ اُس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے آ رہے تھے۔

"بغاوت!" وہ چلّایا،

دِلی نے بھی اپنا سینہ پیٹنا شروع کر دیا اور اپنی ٹھوڑی کے لٹکے ہوئے گوشت کو نوچنے لگا، اور کہیں دور نظریں جما کر چلّایا "بغاوت!"

اور پھر چاند کا رنگ باسی روٹی کی طرح بالکل پھیکا پڑ گیا، اور فاختہ اُستانی کے ارد گرد نہایت تیزی سے تیرتی رہی، اور ناریلوں نے اپنے سائے سمیٹ کر اپنے اندر جذب کر لئے، اور ندیوں کا سرمئی پانی گول مول لہریئے سنگریزوں پر اچھلتا کودتا گنگنانے لگا!

اور بِکی ان گنت آہنی اور کالے بھجنگ ہاتھوں کے سمٹتے ہوئے محاصرے سے بوکھلا کر پیچھے ہٹتا آیا۔ اور جب پانی میں قدم رکھا تو چلّایا "دِلی!"

اور دِلی نے آواز دی۔ "میں ابھی کچھ دیر کے بعد حاضر ہو رہا ہوں بھائی، میں شیو کر لوں، تم فی الحال ہمت سے کام لو، اور یہ گولا اِدھر پھینک دو، میں سنبھال رکھوں گا"—— اور پھر وہ خلوف کی طرف دیکھ کر خوشامدانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

بِکی جو ایک ہاتھ سے راکٹ گھسیٹتا آ رہا تھا، اور دوسرے ہاتھ میں گولے کو جکڑ رکھا تھا، تھم گیا، راکٹ کو چھوڑ کر اُس نے جیب سے ایک اور گولا نکالا اور نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اور اپنا سارا لہو آنکھوں میں لا کر ایک گولا آہنی ہاتھوں کے محاصرے پر پھینکا اور دوسرا پورب کی طرف، مگر دونوں گولے اوپر ہوا میں ابھر کر ٹکرائے، دِلی چیختا ہوا آیا، ہانپتا ہوا خلوف سے لپٹ گیا، اور

مر کو ریت میں دبا کر لیٹ گیا - پھر ہوا دس کی دھجیاں اڑا دینے والا دھما کا پیدا کر گئے ، گولے سُرخ ، نیلے اور سبز شعلوں کی لمبی لمبی قلموں کی بارش بن کر کشتی میں سوار ہوتے ہوئے پکی پر برس پڑے ، اُستانی نے زمد کی ایک چیخ ماری اور بھاگ کر پورب والوں کے دلدلی ٹیلے پر آگری ، اور فاختہ ایک گیند کی طرح اُس کی جھولی میں گر کر سہمی سہمی اُسے دیکھنے لگی ، پوربی بچے ایک دم کچھ چپنے اور ورد کرنے لگے ، ساری دھرتی کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ ڈالا تھا !

اور پھر آگ کے اِس طوفان میں سے " زدوم " کی ایک طویل گرج پیدا ہوئی اور راکٹ آنکھ کی جھپکی میں دھوئیں میں سے نکلتا فضا کو ایک طویل قوس سے چیرتا پھاڑتا ، دُور باسی اور مضمحل چاند کے مرے مرے اجالے کے مقابل ایک نقطہ بن کر غائب ہو گیا !

" زدوم " کی یہ آواز جیسے چاروں کھونٹ پھیلتی چلی گئی ، اور پھر مشرق سے کرنوں کی پچکاری چھوٹی ، رات بھر کی تھکی ماندی اور دھماکے سے ڈری سہمی فاختہ اُبھر کر اوپر ناریل کی ایک ڈولتی ہوئی شاخ پر جھولنے لگی ، ہر طرف کلیاں کچھ اس طرح چٹکیں جیسے مرمریں فرش پر اشرفیاں گرتی ہیں ، چھٹتی ہوئی دھندیں لپٹے ہوئے مغرب و مشرق کے جزیروں پر سے بچے " ماں - ماں " پکارتے ہوئے آگے بڑھے ، اور کروڑوں کوس دور سے جھونکوں کے بازوؤں پر سوار ہو کر آنے والی موسیقی قریب آنے لگی —— قریب آتی گئی —— ،

اور پھر جب پورب پچھم کے کالے گورے ، پیلے نیلے بچے اُستانی سے بیلے کے گجرے لے لے کر رقص کرتے ہوئے دائرے میں شامل ہونے لگے ،

تو انہوں نے دیکھا کہ اُن کی اُستانی تو بالکل جوان ہے، اُس کے حُسن میں گلاب اور چمپا رچے ہوئے ہیں، اس کی سانسوں تک میں مہک ہے، اس نے اپنے سیاہ بالوں میں جو نئے نئے سورج کی شعاعوں میں سنہری جھلکی مار جاتے ہیں، گندم کی بالیں سجا رکھی ہیں، اُس کے ہونٹوں میں شفق گھل گئی ہے اور ان میں سے ایک نغمہ رِس رہا ہے، —— مدھم —— اور مسلسل —— مدھم اور مسلسل —— مدھم اور مسلسل!

مصوّر

(ایک ریڈیائی کھیل)

[دربارِ شاہی میں ہجوم کی سرگوشیاں ابتدا میں چند لمحے جاری رہتی ہیں اور پھر]

ایک آواز:- (دبی ہوئی مگر تیز سرگوشی میں) - خاموش! وزیرِ اعلیٰ سیّاس اور وزیرزادہ عباس تشریف لا رہے ہیں۔

[خاموشی کا مختصر سا وقفہ جو وزیر اور وزیرزادے کے قدموں کی چاپ سے ٹوٹ جاتا ہے]

عباس:- شاہِ غاسان نے ہماری مبارز طلبی کا کوئی جواب بھیجا ہے ابّا جان؟

سیّاس:- میرے خیال میں آقائے عالی وقار شاہِ طغران نے غاسانیوں کو لاجواب کر دیا ہے۔

عباس:- شاہ ذی جاہ کو بھی تو مبارز طلبی کا ایک ایسا ڈھنگ سوجھا ہے کہ غاسان چاہے اپنی ساری جسمانی اور روحانی قوّتوں کو بروئے کار لے آئے وہ ہم طغرانیوں

کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

سیّاس :- مقابلے میں کامیابی کا سوال تو جب پیدا ہوتا بیٹا کہ غاسانیوں کو ہمارے مقابل آنے کی ہمّت ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اب خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر صوبہ ریاض ہماری سلطنت سے منسلک کر لیا جائے گا۔

عباس :- میں سوچتا ہوں اباّ جان، کہ اگر دنیا کی تمام سلطنتیں اپنے جھگڑوں کو اسی طرح فیصل کرنے لگیں، تو تلواریں ڈھالنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور انسانی خون کی ارزانی ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ جائے۔

سیّاس :- مصیبت یہ ہے عباس بیٹا۔ کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو فن کو تلوار پر فوقیت دینے کے قائل ہوں۔ ہمارے داناؤں اور حکیموں نے کہا ہے کہ فن تلوار سے افضل ہے۔ اس لئے جب مقابلہ ٹھن جائے تو سب سے پہلے فنی ہتھیار استعمال کرنے چاہئیں۔ اور جب ان ہتھیاروں کی دھاریں مسلول ہو جائیں۔ تو بے شک لوگ وحشت اور بربریت پر اتر آئیں۔ لیکن ہمارے فیلسوفوں کو یقین ہے کہ فن غیر فانی ہے۔ اس لئے فنی ہتھیار کبھی بے کار نہیں ہو سکتے۔

عباس :- اباّ جان۔ داناؤں نے فنی ہتھیاروں کو اس قدر کیوں اچھالا ہے؟ جبکہ کہا جاتا ہے کہ تصوّف۔ روحانیت کا بلند ترین اور مقدس ترین مقام ہے۔ اور فن ہر حال میں اس سے ہیٹا ہے۔

سیّاس :- اپنا اپنا خیال ہے بیٹا۔ جب کسی ملکی مسئلہ کی گتھی سلجھانے سے نہ سلجھے تو جانتے ہو ہمارے آقائے عالی وقار شاہِ طغران کیا کرتے ہیں۔

عباس :- ستار سنتے ہیں۔

سیّاس :- ہاں۔ ستار سنتے ہیں۔ یا رقص ملاحظہ فرماتے ہیں۔ یا کسی سنگتراش کا شاہکار منگوا بھیجتے ہیں۔ یا کسی مصوّر کی ایک سادہ سی تصویر دیکھ لیتے ہیں اور آن کی آن میں اُن پہ دنیا جہان کی تمام حقیقتیں عیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے تو انہوں نے شاہِ غاسان کو کہلا بھیجا ہے کہ صوبہ ریاض پر حکومت کرنے کا حق صرف طغرائیوں کا ہے جو صدیوں کی کسی پرانی غلطی سے مملکتِ غاسان میں شامل ہے۔ تلوار نکالنے سے پہلے اِس حق پر غور کرو اور اگر ہم سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہو تو سب سے پہلے فنّی لڑائی لڑو اور تین مہینوں کے اندر اندر اپنی فنّی عظمت ثابت کرسکو تو کرو ورنہ صوبہ ریاض کو بزورِ شمشیر سلطنتِ طغرایان میں شامل کر لیا جائیگا

عباس :- ابّا جان۔ سُنا ہے کہ غاسان کے مغنّی جب اپنے سازوں کے تار چھیڑتے ہیں، تو بادل لڑکھڑا کر زمین پر بچھ جاتے ہیں۔ اور پھول مہک کر اوپر فضا میں معلق ہو جاتے ہیں۔

سیّاس :- (ہلکے سے ہنس کر) یہ غلط ہے بیٹا۔ یہ جھوٹی افواہیں ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ شاہ غاسان چند ہی روز میں مشہور مغنّی ریحان کو ہمارے ہاں بھیجے گا ہمیں فنّی شکست دینے کے لئے۔

عباس :- اور اس کے مقابلے میں آئے گا ہمارا سحر کار مغنی رحمان! ہماری فتح کا اعلان کرنے کے لئے۔

سیّاس :- اور اگر شاہ غاسان ابھی تک لاجواب نہیں ہوا تو رحمان کے ستار کے تار اُسے اپنی تقدیر کا لکھا سُنا دیں گے۔

[شاہ کی آمد کے اعلان کی خاطر سب سے اول کہیں دور دمدمہ

پرچھٹیں پڑتی ہیں اور پھر دربار میں ایک جلال آمیز ساز کے سُر
اُبھرتے ہیں جو آخر کار بہت مدّھم ہو کر شاہ طغران کے قدموں
کی چاپ میں بدل جاتے ہیں۔

ایک آواز:۔ طغران کی نئی صبح اپنے شہنشاہ کے حضور میں نقرئی کرنوں، بوقلموں پھولوں اور اَن گنت خوشبوؤں کی ڈالی نذر کرتی ہے۔

شاہ:۔ (تھکے ہوئے انداز میں) وزیرِ اعلےٰ سیّاس!

سیّاس:۔ آقائے عالی وقار۔

شاہ:۔ آج تمام رات ہمارا ذہن ایک عجیب سے خلفشار سے دوچار رہا اور جب مشرق سے افق کی کمان نے شعاع کا پہلا چلّہ چڑھانا چاہا تو ہمارے دل میں تمنّا پیدا ہوئی کہ کوئی ہماری بے خواب روح کو تھپکے۔ ایک بُت۔ ایک رقص۔ ایک شعر۔ ایک تصویر۔ ایک نغمہ —— ہم قصرِ شاہی میں صبحِ صادق کے دھندلے اُجالے میں گھومتے پھرے۔ ہم نے فنونِ لطیفہ کے ہر شہکار سے اپنی احتیاج ظاہر کی مگر ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہمارا وجدان دم توڑ چکا ہے اور ہمارے باطنی جلال کا چاند گہنا گیا ہے۔

سیّاس:۔ فن غیر فانی ہے عالی وقار۔

شاہ:۔ (ذرا تیزی سے جس میں بیزاری بھی ہے اور غصہ بھی) ہم نے فنا اور بقا کے اسرار کو سمجھنے کے لئے اپنی نیندیں لٹا دیں۔ لیکن بس یہی بات سمجھ میں آئی کہ سُوت کی انٹی سلجھانے سے اُلجھتی ہے اور سُلجھ جائے تو کچّے تار کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ دامن گیر ہو جاتا ہے۔

ستّیاس :- شہنشاہ نے تو بے شمار اُلجھنیں سُلجھائی ہیں۔

شاہ :- اور شاید اسی لئے ہماری زندگی کا تار ٹوٹنے کو ہے۔

ستّیاس :- (جلال سے) اپنے شہنشاہ کی حیات کو طویل سے طویل تر کرنے کے لئے موت تک کی ہنسی اڑا سکتا ہے۔

شاہ :- تم آپے سے باہر ہو چلے ستّیاس - ہماری یہ گفتگو رازدارانہ تھی اور درباری چونک اُٹھے ہیں —— (سرگوشیاں)

عباس :- اگر غلام زادے کو اجازت مرحمت فرمائی جائے تو ان تمام الجھنوں کا ایک علاج تجویز کرنے کی جرأت کرے۔

شاہ :- تم غلام زادے نہیں عباس - وزیر زادے ہو۔ ہمیں تمہارا علاج قبول ہوگا - بعض اوقات جوانیاں برف کے گالوں سے چنگاریاں اور آگ کے شعلوں سے پھول چن لاتی ہیں۔ ہمیں اس کا تجربہ ہے - تمہیں اجازت ہے

ستّیاس :- (سرگوشی میں) عباس بیٹا! کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ عتاب شاہی نازل ہو۔

عباس :- (سرگوشی میں) بے فکر رہئے ابّا جان —— (بلند آواز میں) رحمان مغنی کو حضور پر نور کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت بخشی جاتی ہے۔

(ستار کا ایک تار تن سے اس کا جواب دیتا ہے۔ اور پھر رحمان مغنی کے قدموں کی چاپ اُبھر کر ایک جگہ رک جاتی ہے)

شاہ :- وزیر اعلیٰ ستّیاس - ہم وزیر زادہ عباس کی دُور اندیشی اور خوش مذاقی پر تمہیں مرحبا کہتے ہیں۔

سیّاس :- مجھے آقائے عالی وقار کے ان ارشادات پہ ناز رہے گا۔
عباس :- اور مجھے حضور پُر نور کا یہ فرمان شمع راہ کا کام دے گا۔
شاہ :- رحمان! کیا سوچ رہے ہو؟ تم اور راغب مصوّر ہی تو دو ایسی شخصیتیں ہو جن کو ہم نے شمشیر و سپاہ پر بھاری کر رکھا ہے۔ دیکھتے نہیں ستار کے تار تمہاری انگلیوں کی پوروں کو کیسی حسرت بھری نگاہوں سے تک رہے ہیں۔

[رحمان ستار بجاتا ہے اور جب اس کی انگلیوں میں والہانہ تیزی بھر جاتی ہے تو اچانک دربار کے پورے سرے پر شور و غوغا بلند ہوتا ہے۔]

شاہ :- (غصّے میں) ہمارے خیالوں پر برستی ہوئی نغموں کی پھوار کو کس نے چوسنے کی جرأت کی ہے؟ کس نے ہمارے جذبات کے ہلکورے کھاتی ہوئی ڈالیوں پر ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ کیا ہے — اِس شور مچانے والے ہجوم کو فوراً ہمارے سامنے حاضر کیا جائے!

[شور بہت قریب آجاتا ہے اور پھر رُک جاتا ہے]

نوروز :- غلام کورنش بجالاتا ہے۔
شاہ :- نوروز؟ زندان کے مہتمم ہونے کے باوجود تمہیں اب تک ہجوم کو اپنی گرفت میں لانے کا سلیقہ نہیں آیا۔ کیوں؟
نوروز :- غلام مجبور تھا عالی جاہ!
شاہ :- مجبور؟ تم نے اس ذلیل لفظ کو ہمارے سامنے دُہرانے کی جرأت کیوں کی؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم نے شاہی فرمان سے طہران کی تمام فرہنگوں سے یہ

لفظ خارج کر دیا ہے۔ مجبوری ذلت ہے، بے دست و پائی ہے، محتاجی ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ طغران کا کوئی باشندہ ہماری پناہ میں رہ کر اپنے آپ کو مجبور تصور کرے۔

نوروز:۔ غلام درگزر کا طالب ہے۔

شاہ:۔ کہو، یہ شور کیسا تھا؟

نوروز:۔ دربارِ عام میں اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے زبان رُکتی ہے عالی جاہ! اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو غلام کو خلوت میں تمام حالات عرض کرنے کی سعادت بخشی جائے۔

شاہ:۔ نہیں ـــــ ہم اُن کجکلاہوں میں شامل نہیں ہیں، جو لنگوٹی میں پھاگ کھیلا کرتے تھے۔ ہمارا ہر راز ہماری رعایا کا راز ہے۔ جب ہماری رعایا کے کسی فرد کی جبین پر کوئی شکن نمودار ہوتی ہے تو شاہی ماتھے پر شکنوں کا ایک جال بچھ جاتا ہے۔ ہمارے قہقہے رعایا کے قہقہوں سے عبارت ہیں اور رعایا کے آنسوؤں نے ہمیں خلوتوں میں اکثر رُلایا ہے۔

نوروز:۔ یہ معاملہ براہ راست ـــــ (رُک جاتا ہے)

شاہ:۔ رُک کیوں گئے؟

نوروز:۔ عالیجاہا۔ یہ معاملہ براہ راست۔ شاہِ طغران کی نورِ نظر شاہزادی بلقیس سے تعلق رکھتا ہے۔

شاہ:۔ بلقیس سے؟ ہماری بیٹی سے؟ ـــــ اور تمہارا خیال یہ ہے کہ ہماری رعایا کے لئے ہماری بیٹی ہمیشہ ایک راز ہے۔ رعایا بادشاہ کی معنوی اولاد ہے اور

نوروز بلقیس صرف اسی لئے راز نہیں رہ سکتی کہ وہ ہماری بیٹی ہے۔ کھُلے بندوں کہہ دو جو کچھ کہنا ہے۔

نوروز:۔ عالیجاہا۔ میں اپنے گھر سے نکل کر زنداں کی طرف جارہا تھا کہ شاہی قصر کے مشرقی دریچے کے نیچے مجھے ایک ہجوم نظر آیا۔ قریب جاکر دیکھا تو عالیجاہ کے محبوب مصوّر راغب ایک آوارہ سے نوجوان کو تھامے کھڑے تھے اور ہجوم اُس نوجوان کی آنکھیں پھوڑ دینے کا تقاضا کر رہا تھا۔

شاہ:۔ کیا راغب ابھی تک دربارِ شاہی میں نہیں آیا؟

راغب:۔ کورنش بجالاتا ہوں شاہِ ذی جاہ۔

شاہ:۔ راغب۔ نوروز سُنی سنائی بات کہہ رہا ہے۔ ہم آنکھوں دیکھے واقعہ کو فوقیت دیتے ہیں۔ کہو کیا بات ہوئی۔

راغب:۔ شاہِ ذی جاہ میں آج طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے کے لئے دریا کے کنارے چلا گیا تھا۔ مگر اس نظارے سے اس قدر سرشار ہوا کہ دریا کی لہروں پر ـــــ آفتاب کی بکھری ہوئی قاشوں کا ناچ دیکھتے دیکھتے بہت دیر ہوگئی چونک کر میں دربارِ شاہی میں حاضر ہونے کو لپکا اور جب قصرِ شاہی کے مشرقی دریچے کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آوارہ نوجوان محل کے دریچے پہ نظریں گاڑے دم بخود کھڑا ہے اور دریچے میں ـــــ

شاہ:۔ اور دریچے میں؟

سیّاس:۔ دریچے میں کیا تھا راغب؟

راغب:۔ اور دریچے میں ـــــ

شاہ:- (غصے میں) کون تھا دریچے میں؟

راغب:- شاہزادی بلقیس

شاہ:- بلقیس؟

عباس:- دریچے میں شاہزادی کھڑی تھیں۔

شاہ:- اور بلقیس اس نوجوان کو دیکھ رہی تھیں؟

راغب:- نہیں عالی جاہ۔ نوجوان بلقیس کو دیکھ رہا تھا

شاہ:- سچ سچ بتاؤ۔

راغب:- عالیجاہ کے سامنے جھوٹ بولنے کی کسے جرات ہو سکتی ہے؟

شاہ:- تو پھر کہاں ہے وہ نوجوان جس نے بجلی کو چابک سمجھ کر اسے ہاتھ میں لینا چاہا۔ جس نے شعلے کو پھول سمجھ کر اُسے سونگھنا چاہا جس نے شاید یہ نہیں سنا کہ شاہ طغران کی تیوری تلوار کا کام کرتی ہے۔ اور اُس کے ہونٹوں کی ایک ذرا سی حرکت حکومتوں کے تخت الٹ دیتی ہے۔ کہاں ہے وہ نوجوان؟

عباس:- کہاں ہے وہ نوجوان جس نے شاہزادی پر ناپاک نظریں ڈال کر مملکتِ طغران کی تمام بہو بیٹیوں کو گھورنے کا حوصلہ کیا ہے۔ اگر حضورِ پُر نور کی اجازت ہو تو عباس اسے اپنی یہ تلوار دے کر ـــــ

(تلوار میان سے نکالنے کی آواز)

شاہ:- ہماری میانوں میں سے تلواریں اتنی عجلت سے نہیں نکل آیا کرتیں وزیرزادے!

عباس:- (تلوار کو آہستہ سے میان میں ڈالنے کی آواز) غلام درگزر کا طالب ہے؟

سیاس:- عباس نوجوان ہے آقائے عالی وقار۔ اور جوانی چڑھتا اور بڑھتا ہوا

سورج ہے۔ میں اپنی طرف سے اپنے آقا کی خدمت میں یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ اگر اس نوجوان کے انجام کا اعلان تلوار کی زبان سے ہونا قرار پائے تو عباس کی تلوار جو میان سے نکل کر اپنے بادشاہ کے خوف سے پھر میان میں دبک گئی۔ اس اعزاز کے لئے چُنی جائے۔

شاہ:۔ تمہاری یہ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ عباس! ہاں تو وہ نوجوان کہاں ہے۔

راغب:۔ نوروز اُسے لینے گیا ہے عالی جاہ۔

شاہ:۔ مگر اس نے اتنی دیر کیوں لگادی ہے؟ کیا نوروز اس قدر نادان ہے کہ وہ ہمارے دل میں سُلگتے ہوئے جہنم اور ہمارے دماغ میں کڑکتی ہوئی بجلیوں کا اندازہ نہیں لگا سکا؟

راغب:۔ وہ اس نوجوان کو دربارِ شاہی کے آداب بتانے گیا ہے عالیجاہ!

شاہ:۔ (غصے میں) میں پوچھتا ہوں جس شخص نے بادشاہِ وقت کی عزیز ترین امانت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اُسے دربارِ شاہی کے آداب سکھانے سے کیا فائدہ؟ قتل کرنے والے کو یہ بتانا کہ دوسرے کے منہ پر تھپڑ نہیں مارا کرتے۔ بے وقوفی ہے اور نوروز بے وقوف ہے — حاضر کرو اُسے۔

[خاموشی کا وقفہ — کھسر پھسر شروع ہوتی ہے مگر دب جاتی ہے]

نوروز:۔ (کڑک کر) کورنش بجالاؤ — (خاموشی)

نوروز:۔ کورنش بجالاؤ — (خاموشی)

شاہ:۔ نوجوان!

پرویز:۔ شاہِ طغران

شاہ :۔ کون ہو تم !

پرویز :۔ میں انسان ہوں۔

شاہ :۔ کہاں کے رہنے والے ہو ؟

پرویز :۔ ساری دنیا میرا وطن ہے۔ ندی کنارے کی ریت، میدان کا سبزہ اور پربتوں کی دھندلی گھاٹیاں میرا بستر ہیں اور تاروں بھرا آسمان میرا خیمہ ہے۔ یہاں وہاں، ہر مقام میرا ہے۔ میں کائنات کا دولہا ہوں۔ کیونکہ میں انسان ہوں۔

عباس :۔ استعاروں میں باتیں کرکے ہمیں متأثر کرنا چاہتا ہے آوارہ۔

شاہ :۔ خاموش عباس۔

پرویز :۔ (دھیرے سے ہنس کر) آوارہ ! عباس نے اپنی طرف سے مجھے گالی دی ہے حالانکہ آوارہ میرا لقب ہے اور مجھے اس لقب پر فخر ہے۔ کیونکہ فن آوارگی کے سوا پنپ ہی نہیں پاتا۔

شاہ :۔ نوجوان ! سنبھل کر بات کرو اور یہ نہ بھولو کہ اس وقت تم شاہِ طہران کے حضور میں مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہو۔

پرویز :۔ اور مجھے اس نامعلوم جرم کی سزا بھی مل چکی ہے۔ اگر میں اپنے سینے پر سے لبادہ اٹھا کر آپ کو چند تازہ زخم دکھادوں تو کہیں میں درباری آداب کی خلاف ورزی تو نہیں کروں گا۔

شاہ :۔ تازہ زخم ؟ تمہیں کس نے سزا دی ؟

پرویز :۔ میں کسی کا نام لے کر اس پر عتابِ شاہی نازل کرنے کا سبب نہیں بنوں گا۔ کیونکہ میں نے شاہی ذہنیت کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ بادشاہ

چیونٹی کو مسل ڈالتے ہیں اور شیر کو بخش دیتے ہیں (طنزیہ ہنسی) بھولے بادشاہ!

شاہ:- نوروز! ــــ اسے زندان کی تاریک ترین ــــ مگر نہیں، یہ ہمارا قاعدہ نہیں - ہم بھٹک چلے تھے ــــ نوجوان کیا آج سویرے تم قصرِ شاہی کے مشرقی دریچے کے نیچے پکڑے گئے تھے؟

پرویز:- مجھے یہ علم نہیں کہ وہ دریچہ مشرقی تھا - یا مغربی، کیونکہ اُس وقت شش جہات نے سمٹ کر ایک مرکز قبول کر لیا تھا - لیکن ایک دریچے کے نیچے مجھے پکڑا ضرور گیا -

شاہ:- کس جرم میں؟

پرویز:- ابھی تک مجھے اپنے جرم کی نوعیت معلوم نہیں ہو سکی -

راغب:- عالیجاہ! اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں -

شاہ:- ہمارے محبوب مصوّر راغب کو اجازت ہے -

پرویز:- مصوّر، کیا تم بھی مصوّر ہو؟

راغب:- جب تم کو دریچے کے نیچے سے پکڑا گیا تو اُس وقت دریچے میں کون تھا -

پرویز:- ایک لڑکی تھی، جس کی آنکھیں نیلے سمندروں کی پناہ گاہیں معلوم ہوتی تھیں -

عباس:- حضورِ پُرنور - یہ آوارہ گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہے -

شاہ:- ہم اس سے غافل نہیں عباس، لیکن مجرم کو مفصّل بیان کا حق پہنچتا ہے -

راغب:- کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکی کون ہے؟

شاہ:- نہیں یہ سوال بے ہودہ ہے۔ مملکتِ طغران میں ہر لڑکی کی عصمت ہماری امانت ہے۔

راغب:- عالی جاہ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نوجوان سلطنتِ طغران کا باشندہ نہ ہو۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ شاہزادی بلقیس پر نگاہیں ڈالنے کا گنہگار ہے۔

پرویز:- مجھے معلوم نہ تھا کہ دریچہ قصرِ شاہی کا تھا اور دریچے والی شاہزادی بلقیس تھی۔

شاہ:- اور اگر تمہیں یہ معلوم ہوتا تو کیا پھر بھی تم یہ جرأت کر سکتے تھے؟

پرویز:- حسن جہاں بھی ملے اور جس صورت میں بھی ملے۔ فن کار کا نشانہ ہے۔

شاہ:- تم فن کار ہو؟

پرویز:- میں مصوّر ہوں۔

راغب:- تم بھی مصوّر ہو؟

شاہ:- اور کیا تم جانتے ہو کہ مملکتِ طغران میں فنِ مصوّری کا معیار کتنا بلند ہے؟

پرویز:- فنی کمال کا کوئی آخری نقطہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ:- تم نے آج ہمارے جلال کو بُری طرح جھنجھوڑا تھا۔ لیکن تمہارے فنِ کارانہ بھولپن سے ہم اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ تمہیں بخش دیئے بغیر چارہ نہیں۔

عباس:- شہنشاہ!

سیّاس:- آقائے عالی وقار!

شاہ:- ہم نے عباس کو جو لفظ استعمال کرنے سے روکا تھا۔ وہی بار بار ہماری زبان کی نوک پر تڑپ رہا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ اس نوجوان مصوّر کو بے گناہ سمجھ کر آزاد کر دیں۔ تم کیا سوچ رہے ہو راغب؟

راغب:۔ عالیجاہ کی وسعتِ جود و سخا کو اپنے ذہن میں سمو لینے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں عالیجاہ۔ کہ کہیں اس نوجوان نے شاہ طغران کی فنی قدردانی سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا — کیا یہ سچ مچ کا مصوّر ہے یا بہروپیا ہے۔

شاہ:۔ ہاں۔ تمہارے پاس اپنے مصوّر ہونے کا ثبوت ہے؟

پرویز:۔ میرا سارا وجود۔ میری ساری شخصیت۔ میری رگ رگ اور نس نس اس امر کا ثبوت ہے کہ میں مصوّر ہوں۔

شاہ:۔ کوئی مرئی ثبوت پیش کرو — جیتا جاگتا — ٹھوس ثبوت۔

پرویز:۔ فن کو ٹھوس ایسے کرخت بولوں سے آلودہ نہیں کرنا چاہیئے۔

راغب:۔ ملاحظہ فرمایا عالیجاہ نے؟ یہ نوجوان صرف بن رہا ہے۔

شاہ:۔ وزیرِ اعلیٰ سیّاس۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

سیّاس:۔ مجھے اس نوجوان کے بیان پر شبہ ہے۔

عباس:۔ اور مجھے بھی حضور پُر نور — اس کے ماتھے اور کانوں اور گردن پر جھولتی جٹائیں۔ اس کی ادھ کھُلی خطرناک آنکھیں۔ اس کے مضبوطی سے جڑے ہوئے ہونٹوں کی طنزیہ تڑپ۔ اس کی گردن کا فرعونی خم۔ یہ سب باتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ یہ مصوّر نہیں۔ کوئی جاسوس ہے یا محض آوارہ۔

پرویز:۔ عباس۔ ہم تم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں تمہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ میں تمہارے دل کی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ تم کسی گہرے روحانی صدمے سے دو چار معلوم ہوتے ہو۔

مجھے تم سے ہمدردی ہے۔

شاہ:۔ (قدرے غصّے سے) اپنے مصوّر ہونے کا ثبوت پیش کرو۔

راغب:۔ سنتے ہو؟

پرویز:۔ سن رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں۔ کہ اگر میں اپنے مصوّر ہونے کا ثبوت پیش کرنے سے انکار کر دوں تو شاہِ طغران میرے لئے کون سی سزا تجویز کریں گے۔

شاہ:۔ (مزید غصّے سے) ثبوت پیش کرو۔

پرویز:۔ (حوصلے سے) سزا تجویز کیجئے۔

شاہ:۔ (اچانک حیرت سے) لیکن تمہیں ثبوت پیش کرنے سے انکار کیوں ہے؟

پرویز:۔ وہ بادشاہ۔ جس کی سلطنت پر فن حکمران ہے۔ اگر ایک سچّے فن کار کے چہرے پر فنی جلال نہیں دیکھ سکتا۔ تو اسے چاہیئے کہ وہ بادشاہوں کی پرانی روش اختیار کرلے اور تلوار کو میان سے آزاد کر کے اپنی زمین پر انسانی لہُو کے گل بوٹے بنا دے۔

شاہ:۔ تم اپنے جرائم میں اضافے پر اضافہ کرتے جا رہے ہو۔ ہمارے ہاں تلوار کی حیثیت ثانوی سہی۔ لیکن ابھی اس کی دھار کند نہیں ہوئی اور یہ وہی تلوار ہے جو ہمارے اجداد کی گرفت میں آکر چٹانوں تک کے کلیجے میں اُتر گئی ہے۔

پرویز:۔ میں اپنے جرم کی سزا چاہتا ہوں۔

شاہ:۔ شائد تم اس بات سے بے خبر ہو کہ تمہارا جرم ہولناک ہے اور اس لئے اس کی سزا بھی ہولناک ہو گی۔

پرویز:۔ (تلخی سے) مجھے ہولناک سے ہولناک سزا قبول ہے۔ لیکن میں یہ برداشت

نہیں کر سکتا کہ اتنے بد مذاقوں کے ہجوم میں میرا مذاق اڑایا جائے۔

شاہ:- ہمیں تمہاری زبان درازی نے مجبور کر دیا ہے کہ ہم پھر سے تمہارے جرم کو ابتدا سے سنیں۔

پرویز:- میں ہر جواب کے لئے تیار ہوں۔ اس گھٹے گھٹے سے جمے جمے ماحول سے مجھ کو جلد چھٹکارا ملنا چاہیئے۔

شاہ:- اور اگر تمہیں اپنی زندگی ہی سے چھٹکارا دلایا گیا تو؟

پرویز:- موت اور حیات کا فاصلہ فن کار کے نزدیک ایک قدم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا

شاہ:- (کڑک کر) تم نے شاہزادی کو دیکھا ——— ہماری بیٹی کو؟

پرویز:- میں نے ایک دریچے میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا ——— میرے لئے ایک شہزادی اور ایک دہقانی لڑکی ——— دونوں ہم پایہ ہیں۔ کیونکہ دونوں عورتیں ہیں۔

شاہ:- کیا شہزادی نے بھی تمہاری طرف دیکھا تھا؟

پرویز:- ایک مرتبہ دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔

شاہ:- کسے؟

پرویز:- مجھے۔

شاہ:- یہ غلط ہے۔

پرویز:- مجھے اس الزام کا ثبوت چاہیئے۔

شاہ:- ہم کہتے ہیں تمہارا بیان غلط ہے۔

پرویز:- مجھے اس الزام کا ثبوت چاہیئے۔

عباس:- اس کا ثبوت۔ اس کا ثبوت یہ تلوار ہے (تلوار نکالنے کی آواز) جو تمہارے ـــ

شاہ:۔ نہیں عباس ۔ تم خاموش رہو ۔ اس کا ثبوت خود بلقیس مہیا کرے گی ۔ بلقیس کو ہمارے حضور حاضر کیا جائے ۔

سیّاس:۔ کھلے دربار میں جہاں پناہ ؟

شاہ:۔ ہاں سیّاس ۔ کیوں کہ انصاف خلوتوں میں نہیں پنپ سکتا ۔ بلقیس کو حاضر کیا جائے ۔

سیّاس:۔ پیغام بھجوا دیا گیا ہے جہاں پناہ ۔

شاہ:۔ اور بلقیس کے بعد ہم اس نوجوان سے اس کے دعوے کا ثبوت مانگیں گے ۔ یقیناً یہ مصوّر نہیں ۔

عباس:۔ اور عالیجاہ ۔ اگر یہ مصوّر ہو ۔ تب بھی اس کے جرم کی شدّت میں کمی نہیں آ سکتی ۔

شاہ:۔ ہمارا محبوب مصوّر راغب اس کی مصوّری کو پرکھ لے گا ۔

راغب:۔ غلام ہر حکم کی تعمیل کرے گا ۔ ویسے اس نوجوان کی باتوں میں رنگوں اور خطوں کی دلآویز آمیزشیں ضرور جھلک رہی ہیں ۔

عباس:۔ عالی جاہ کو اس کا ثبوت چاہیئے ۔ جھلکیاں حقیقتیں نہیں ہوا کرتیں ۔

راغب:۔ ہر جھلکی حقیقت ہے عباس ۔ یہ فن کا راز ہے ۔ تلوار کا نہیں ۔

شاہ:۔ ہمارے درباری آج آدابِ مجلس سے بیگانہ ہو چلے ہیں ۔ عباس اور راغب کو آپس میں گفتگو کرنے کی کس نے اجازت دی ؟ (خاموشی) ——— یہ معمّا ایسا نہیں کہ اس کا حل ڈھونڈنے کے لئے تم سب آپس میں دلیل بازی کرنے لگو ۔

ایک آواز:۔ شہزادی بلقیس باریابی کی اجازت چاہتی ہیں جہاں پناہ ۔

شاہ :- اجازت ہے ۔

بلقیس :- (کچھ دور سے) آداب بجالاتی ہوں آبا جان ۔

شاہ :- اس وقت تم بادشاہ کے حضور میں ہو ۔ جہاں ذاتی جذبہ حکومت نہیں کرتا ۔ سامنے آجاؤ ۔ (خاموشی) ہم کہتے ہیں سامنے آجاؤ ۔

بلقیس :- (قریب سے ۔ ڈرتے ڈرتے) جہاں پناہ ——

شاہ :- تم آج طلوعِ آفتاب کے وقت قصرِ شاہی کے مشرقی دریچے میں گئیں ؟

بلقیس :- گئی تھی حضور ۔

شاہ :- اور یہ نوجوان نیچے سے گذرا ؟

بلقیس :- جی ہاں حضور ۔

شاہ :- پھر کیا ہوا ؟ (خاموشی)

شاہ :- (گرج کر) پھر کیا ہوا ؟

بلقیس :- (ڈری ہوئی آواز میں) یہ جاتے جاتے رُک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا ۔

شاہ :- اور پھر ؟

بلقیس :- اور پھر دیکھتا رہا ۔

شاہ :- کب تک ؟

بلقیس :- جب تک شاہی مصوّر راغب نے اُسے پکڑ نہ لیا ۔

شاہ :- اس کے بعد ؟

بلقیس :- اس کے بعد ہجوم نے اُسے گھیر لیا —— اور سب تقاضا کرنے لگے کہ اس کی آنکھوں کو پھوڑ دینا چاہیئے ۔ اتنے میں زندان کے مہتمم نوروز وہاں پہنچ

گئے - اور اسے زدوکوب کیا۔

شاہ:۔ کس کے حکم سے ؟

بلقیس:۔ یہ میں نہیں جانتی ابّا جان —— (رُک کر) جہاں پناہ۔

شاہ:۔ کس کے حکم سے نوروز ؟

نوروز:۔ میں ضبط نہ کر سکا عالی جاہ —— میں جان بخشی کا خواستگار ہوں۔

پرویز:۔ زندان کے مہتمم سے ضبط کی امید نہیں کی جا سکتی —— اگر میری وجہ سے اس پر عتاب نازل ہو رہا ہے۔ تو میں اعلان کرتا ہوں۔ کہ مجھے اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔

شاہ:۔ لیکن ہمیں شکایت ہے نوروز سے —— کہ اس نے ابھی تک ہمارے عزیز ترین قانون کا احترام کرنا نہیں سیکھا۔ مگر یہ فیصلہ بعد میں ہوگا۔ پہلے ہمیں بلقیس سے تمام حالات پوچھ لینے چاہئیں۔ ہاں تو بلقیس۔ تم نے بھی اس کی طرف دیکھا ؟

بلقیس:۔ (ڈر کر) ایک مرتبہ دیکھا تھا جہاں پناہ۔

شاہ:۔ اور پھر —— ؟

بلقیس:۔ اور پھر راغب آ گیا عالی جاہ۔

شاہ:۔ یعنی اس کے دریچے کے نیچے سے گزرنے اور راغب کی آمد تک تم اس کی طرف دیکھتی رہیں۔

بلقیس:۔ جہاں پناہ۔

شاہ:۔ (سخت لہجے میں) کیا تم بھول گئی تھیں کہ تم طغرانی نسل کی آبرو ہو ؟ کیا تم بھول

گئی تھیں کہ طغرانی عورتوں نے غیر مرد کی نگاہوں کی زد میں آکر اپنے اور دیکھنے والے کے سینوں میں خنجر بھونک دیئے۔ کیا تم بھول گئی تھیں کہ تم نے اُس ماں کا دودھ پیا ہے جس نے غاسان کی سرحد پر طغرانی سپاہیوں کو پلٹتے دیکھ کر دشمنوں کی صفوں کی صفیں زمین پر بچھا دی تھیں؟

بلقیس:- میں نے صرف حیرت سے دیکھا تھا جہاں پناہ — کہ اس عجیب سے نوجوان کو میری طرف دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔

سیّاس:- یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے عالی جاہ۔

شاہ:- سیّاس!

عباس:- یہ ایک غیر شعوری عمل ہے جہاں پناہ۔

شاہ:- عباس!

راغب:- شہزادی بے قصور ہے شہنشاہ۔

پرویز:- جی ہاں۔ شہزادی بے قصور ہے۔ اور اگر کوئی قصوردار ہے تو صرف پرویز۔ جس نے شہزادی کو نہیں فن کو دیکھا۔ جس نے شہزادی پر فن کار کی پاکیزہ ترین نگاہ ڈالی۔ جس نے شہزادی کے پیکر میں ایک شاہکار کے خاکے کو مجسّم پایا۔ شہزادی نے حیرت سے پرویز کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔ اس لئے وہ بے قصور ہے۔ پرویز نے احترام سے شہزادی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اس لئے وہ گردن زدنی ہے۔ کیا یہی ہے شاہِ طغران کا انصاف جس کے ڈنکوں نے دنیا بھر کے کانوں کو بہرہ کر رکھا ہے؟

سیاس:- نوجوان!

شاہ:۔ ہم حیران ہیں کہ اس عجیب و غریب مجرم سے کیا برتاؤ کریں۔

راغب:۔ عالیجاہ کی اجازت ہو تو غلام کچھ عرض کرے۔

شاہ:۔ ہاں ہاں۔ کہو راغب اور بلقیس بیٹی۔ اِدھر آجاؤ۔ تم سے مخاطب ہوتے وقت ہم نے اپنے وجود کو دو شخصیتوں میں تقسیم کر لیا ہے۔

بلقیس:۔ (روتے ہوئے) ابّا جان۔

شاہ:۔ (تسلی دیتے ہوئے) رم جھم برستے ہوئے بادلوں میں سے کبھی کبھی بجلیاں بھی گر پڑتی ہیں بیٹی۔ ہاں تو راغب۔ کیا تجویز ہے تمہاری؟

راغب:۔ جہاں پناہ۔ مجھے اس مصوّر سے مقابلے کی اجازت دی جائے۔

شاہ:۔ مقابلہ؟

عباس:۔ عالیجاہ۔ یہ غلام آپ سے وعدہ لے چکا ہے کہ عباس ہی اپنی تلوار سے ــ

راغب:۔ نہیں نہیں وزیر زادے۔ آپ کو غلطی ہوئی۔ میرا مقابلہ رنگوں کی آمیزشوں اور خطوط کے خموں کے زور پر ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے مُوئے قلم کی ایک ذرا سی جنبش اس نوجوان پر اپنی عافیت واضح کر دے گی۔ میں نے تصویر کے لبوں کے تکونی گوشوں میں کپکپی ابھارنے کے لئے ہفتے اور مہینے صرف کئے ہیں۔ آنکھوں کی ایک ایک پلک سنوارنے کے لئے میں نے اپنی شاداب ترین راتیں لٹائی ہیں اور اس لڑکے کا ابھی تجربہ ہی کیا ہوگا؟

پرویز:۔ (غصّے میں) مجھے یہ مقابلہ قبول ہے اور مَیں شاہِ طغران سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے سامنے اسی وقت اس مقابلے کی ابتدا کا اعلان کریں۔

شاہ:۔ کیا نام ہے تمہارا؟

پرویز:- پرویز -

شاہ:- پرویز - یہ کیا بات ہے ؟ کہ پہلے تو تم حد درجہ سہل انگاری کا ثبوت دیتے رہے اور اب یکایک چمک اٹھے ہو -

پرویز:- پہلے میری شخصیت زیرِ بحث تھی - اب میرے فن پر حملہ ہوا ہے اور میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ ہجوم میں سے جس نے بھی میری بقچی مجھ سے چھینی ہے ، وہ لا دے - راغب اسی وقت یہیں آپ کے سامنے اپنا سامان منگوائے اور ہمیں چند پلوں میں کسی چیز کا خاکہ اتارنے کا حکم دیا جائے -

شاہ:- راغب — تمہارا کیا خیال ہے ؟

راغب:- میں حاضر ہوں جہاں پناہ - مگر عالیجاہ کو تکلیف ہو گی انتظار سے -

شاہ:- نہیں ہم اس دوران میں رحمان سے ستار سنیں گے - بقچی کہاں ہے پرویز کی — ؟

نوروز:- یہ حاضر ہے جہاں پناہ -

شاہ:- نوروز ، یہ بقچی پرویز کے حوالے کر دو — راغب اپنا سامان منگوا بھیجئے

راغب:- سب سامان یہیں دربار میں موجود ہے عالیجاہ !

شاہ:- اور تم دونوں ایک ایک - (رُک کر) بلقیس بیٹی ان مصوّروں کو کوئی موضوع سمجھاؤ -

بلقیس:- ایک — ایک حیران چہرہ —

پرویز:- حیران چہرہ — کس کا چہرہ شہزادی ؟

بلقیس:- کسی کا بھی ہو -

راغب :- (اپنے آپ سے) ایک حیران چہرہ - مگر کس کا ؟

شاہ :- بلقیس نے تمہیں موضوع بتا دیا ہے - ہم اس چہرے کا صرف خاکہ دیکھیں گے - صرف خطوط دیکھیں گے - صرف خطوط - چند ہی ثانیوں کے بعد ہم تمہیں طلب کریں گے - رحمٰن اس دَوران میں ستار بجائے گا -

[رحمان ستار بجاتا ہے - چند لمحے ستار بجتا رہتا ہے]

شاہ :- تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے پرویز —— رحمان ستار بند کرو -

[ستار بند ہو جاتا ہے]

پرویز :- مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں - صرف آپ کے بلاوے کا انتظار ہے -

شاہ :- اور حیران چہرے کا خاکہ ؟

پرویز :- تیار ہے -

شاہ :- تیار ہے ؟

راغب :- اتنی جلدی ؟ تم فن کے حضور میں گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو پرویز -

شاہ :- مگر راغب - تم بے شک مکمل کر لو اپنا خاکہ ——

پرویز :- خاکے مکمل نہیں ہوا کرتے شاہ طغران —— خاکے بنیادیں ہوتی ہیں اور بنیادوں کو دیکھ کر ایوانوں کا تصوّر کر لیا جاتا ہے -

شاہ :- اپنا خاکہ ادھر لاؤ -

پرویز :- راغب کو میرا خاکہ دکھایا جائے اور مجھے راغب کا خاکہ - کیونکہ اگر ہم دونوں سچے فنکار ہیں تو کوئی ذاتی دلچسپی ہمارے فیصلوں میں حارج نہیں ہو سکیگی -

شاہ :- تم اپنے خاکے آپس میں بدل سکتے ہو -

راغب:- مگر عالی جاہ - میں تو ابھی ــــ

شاہ:- نہیں راغب - خاکے بدلو ــــ (وقفہ)

پرویز:- راغب - وزیر زادہ عباس کے حیران چہرے کا خاکہ اُتارنے میں تم نے نفاست کا ضرورت سے زیادہ ثبوت دیا ہے - شائد اس لئے کہ یہ وزیر زادے کا چہرہ ہے اور تمہارے دماغ پر وزیرِ اعلےٰ کے عتاب کا خوف سوار تھا -

شاہ:- راغب - تم کیا سوچ رہے ہو - (خاموشی) ــــ راغب!

راغب:- جہاں پناہ!

شاہ:- کیا بات ہے؟

راغب:- مجھے اس سحر کار نوجوان، اس جادوگر مصوّر کی زندگی کی بھیک مطلوب ہے جہاں پناہ -

شاہ:- کیا مطلب ہے تمہارا؟ ہم کچھ نہیں سمجھے -

راغب:- پرویز کی جان بخشی فرمائی جائے -

شاہ:- لیکن آخر کیوں؟

راغب:- کیونکہ اگر پرویز مرگیا تو فن مرجائے گا - حسن لٹ جائے گا - صباحت دم توڑ دے گی -

شاہ:- مگر راغب تمہاری حیرت کا باعث؟

راغب:- پرویز نے ایک حیران چہرے کا خاکہ نہیں اتارا - ساری دنیا کو ــــ ساری کائنات کو ــــ حیرت کے بھنور میں چھوڑ دیا ہے - اس کے

بے پروائی سے کھینچے ہوئے خطوط نے جہاں حیرت کی شدت کا اعجاز پیدا کیا ہے ۔ وہاں حسن بھی ہے ۔ شوق بھی ہے ۔ زندگی کی دھڑکن بھی ہے ۔ اور آدمیت کی رعنائی بھی اور یہ چہرہ ہے — یہ چہرہ ہے —،

شاہ :۔ کس کا چہرہ ہے ؟

راغب :۔ اور یہ چہرہ ہے عالیجاہ — شہزادی بلقیس کا ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔۔

(ہجوم کی سرگوشیوں کی سرسراہٹیں شروع ہو جاتی ہیں)

عباس :۔ یہ گستاخی ہے ۔ صریحاً گستاخی ہے ۔

سیاس :۔ پرویز نے منہ مانگی موت پائی ہے ۔

نوروز :۔ اس کا سر قلم کر دینا چاہیئے ۔ (سرگوشیاں رک جاتی ہیں)

شاہ :۔ آفتاب مشرق سے طلوع ہوتے ہی لپک کر مغرب میں غروب نہیں ہو جاتا ۔ ستارے اپنے مسجود کا طواف مقررہ راہیں چھوڑ کر نہیں کیا کرتے ۔ جذباتی تیزی ۔ ہمت کی کمی اور حوصلے کی خامی ہے ۔ اور شاید ہمارے درباری بھول گئے ہیں کہ روح کے آبگینہ پن اور خیالات کی پاکیزگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہم نے فن کو قرار دے رکھا ہے ۔ یہ تصویر — یہ شعبدہ — یہ اعجاز اس امر کا ثبوت ہے کہ پرویز نے بلقیس پر بری نظریں نہیں ڈالیں ۔ اور ہم پرویز سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہم سے کوئی فرمائش کرے — ہم اسے قبول کر کے پرویز پر کوئی احسان نہیں دھریں گے ۔ اپنے ہی جذبات کو تھپکیں گے ۔

پرویز :۔ مجھے یہ خاکہ واپس مل جانا چاہیئے ۔

شاہ :۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے پرویز ؟ یہ یادگار ہمارے قصر کی رونق بڑھائے گی ۔

پرویز:- مجھے یہ خاکہ واپس چاہیئے!

شاہ:- لیکن آخر کیوں؟

پرویز:- میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع کو مرمر کے ایوانوں کی زینت نہیں بناؤنگا۔

شاہ:- لیکن یہ خاکہ تم نے ہمارے دربار میں اُتارا ہے۔

راغب:- اور ہمارے ہاں کا قاعدہ ہے پرویز کہ جو تصویر دربار میں اتاری جائے وہ شاہی ملکیت ہوتی ہے۔

پرویز:- مگر میں درباروں اور جھونپڑوں کی حدبندیوں سے بلند ہوں۔ مجھے میری تصویر واپس چاہیئے۔

شاہ:- (غصّے میں) شائد تم نے آج تک کسی شاہی دربار میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل نہیں کی۔

پرویز:- مجھے میری تصویر چاہیئے۔

شاہ:- تم کو ایک مہینے کی مُہلت دی جاتی ہے۔ ان تیس دنوں کے اندر اندر تم اپنے آپ سے فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے یا یہ خاکہ۔ اور جب تم فیصلہ کروگے تو تمہاری تقدیر کا لکھا تمہیں سُنا دیا جائے گا۔

پرویز:- مجھے میری تصویر چاہیئے۔ شاہِ طغران میں زندگی اور فن کو ایک ہی میزان میں تولنے کا عادی نہیں ہوں۔ یہ فن کی بے حُرمتی ہے۔

شاہ:- راغب۔ یہ تصویر پرویز کے حوالے کردو۔ ایک مہینے کے بعد ہم یا تو اس سے یہ تصویر لیں گے یا اس کی زندگی ــــ

راغب:- مگر عالی جاہ ــــ

شاہ:۔ یہ ہمارا اٹل فیصلہ ہے۔ اس دوران میں پرویز کو زندان کے کھلے اور روشن کمرے میں رکھا جائے۔ اس کی لیتچی اس سے نہ چھینی جائے۔ اس سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ تاکہ یہ خوشگوار ماحول میں اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کر سکے۔

پرویز:۔ فن کار کی عدالت میں فیصلوں کی نگرانیاں نہیں ہوا کرتیں بھولے بادشاہ!

شاہ:۔ نوروز۔ اسے لے جاؤ۔

نوروز:۔ جہاں پناہ۔ [قدموں کی چاپ —— طبل پر زور کی چوٹ —— بھاری قدموں کی چاپ، قفل کھولنے اور آہنی دروازہ کھلنے کی آواز]۔

نوروز:۔ ابھی تک جاگ رہے ہو پرویز؟

پرویز:۔ میری آنکھوں سے نیندیں بچھڑ چکی ہیں نوروز۔ میری ساری زندگی کی بیداریاں اور خواب ایک نقطے میں جمع ہو کر گھل گئے ہیں (آہ بھر کر) لیکن تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے؟ تم جو زندان کے مہتمم ہو۔ آہنی دروازوں میں قفل چڑھانے اور زنداں کی پتھریلی دیواروں کو بلند تر کرنے کے عادی ہو۔ تم کیا سمجھ گے یہ باتیں!

نوروز:۔ لیکن مجھے تم سے محبت ہے پرویز۔ مجھے تمہاری جوانی سے محبت ہے۔ مجھے تمہاری زندگی سے محبت ہے۔

پرویز:۔ اور نوروز —— مجھے تمہاری انسانیت سے محبت ہے —— انسانیت جو شاہی ایوانوں میں بیوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور غریبوں کے جھونپڑوں اور زندانوں کی تاریکی میں سہاگن کی —— تمہارے وجود میں سہاگن انسانیت

مجسّم ہو چکی ہے —— شہزادی بلقیس کے خاکے کو میری خواہش کے مطابق سرحدِ طغران پر پہنچا دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا —— اور نوروز۔ کاش میں تمہارے اس احسان کے عوض تمہیں کچھ پیش کر سکتا —— کاش!

نوروز:۔ جو احسان بدلہ لینے کی خواہش سے کیا جائے۔ وہ احسان نہیں پرویز۔ تجارت ہے اور میں تاجر نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں۔

پرویز:۔ تم انسان ہو۔ تم سچے انسان ہو۔ اور میں خوش ہوں کہ اس ایک مہینے کی قید کی آخری رات جب دم توڑ رہی ہے۔ تو تم میرے سامنے موجود ہو۔ میرے دوست۔ میرے ساتھی۔ میرے رفیق

نوروز:۔ وہ خاکہ ابھی تک تمہیں یاد آتا ہے پرویز؟

پرویز:۔ وہ ایک بنیاد تھی۔ جس پر میں چاہتا تھا کہ ایک ایوان ابھاروں۔ وہ خاکہ اگر اس وقت میرے پاس ہوتا۔

نوروز:۔ اور اب صبح کو جب جہاں پناہ تم سے آخری فیصلہ سُننے آئیں گے؟ تو؟

پرویز:۔ تو میں یہ خاکہ شاہزادی بلقیس کے قدموں میں رکھ دیتا اور کہتا کہ اے وہ جس کے وجود میں حسن و جمال کی تمام رعنائیاں۔ تمام کمال۔ تمام رفعتیں مجسم ہو گئی ہیں۔ ایک سچے فن کار سے یہ تحفہ قبول کر——

نوروز:۔ جہاں پناہ کے سامنے؟

پرویز:۔ ہاں شاہ طغران کے سامنے۔ فن کے بہت بڑے قدردان کے سامنے۔ میری تمنا تھی کہ میرے ہاتھوں میں وہ خاکہ ہوتا اور میرے لبوں پر یہی باتیں ہوتیں۔ اور شاہ طغران کے ہاتھوں میں تلوار ہوتی —— اور زندگی اور موت

کے پہاڑ آپس میں ٹکراتے تو پرویز کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ ہوتی اور چہرے پر ایک شہید کا جلال۔

[اچانک دُور سے آوازیں آتی ہیں]

عباس:۔ نوروز؟ نوروز کہاں ہیں؟ ارے بھئی ہم نوروز سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم وزیر زادہ عباس ہیں۔ ہمیں زندان کے مہتمم سے ایک ضروری بات کہنی ہے — نوروز — نوروز!

نوروز:۔ وزیر زادہ عباس۔ اس وقت؟ — (بلند آواز سے) آنے دو وزیر زادے کو۔

[قدموں کی چاپ — اسی دوران میں پرویز بولتا ہے]

پرویز:۔ دنیا میں یہ پہلا وزیر زادہ ہے۔ جس کی آنکھ طلوعِ آفتاب سے پہلے کھُلی!

[آہنی دروازہ کھلنے کی آواز]

نوروز:۔ آداب بجالاتا ہوں۔

عباس:۔ معاف کیجئے گا نوروز۔ ہم بے وقت آئے۔ لیکن ہمیں پرویز سے خلوت میں چند باتیں کہنا ہیں — تم پر سلامتی ہو پرویز!

پرویز:۔ فن کار اگر مخلص ہے تو وقت کے ہر دور میں زندہ و سلامت ہے۔ ویسے تمہارے آنے سے مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ نہ جانے کیوں!

نوروز:۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔

پرویز:۔ مگر نوروز۔ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔ یہ مجھ پر تمہارا احسان ہوگا۔

[دروازہ بند ہونے کی آواز]

پرویز :۔ کہو عباس ۔ کیسے آنا ہُوا ؟ اتنی رات گئے ؟

عباس :۔ پو پھٹ چکی ہے ۔

پرویز :۔ خوب ۔ تو پُو پھٹ چکی ۔ اور نیا دن طلوع ہو چکا ۔ مگر تمہاری محبوبہ کہاں ہے ؟

عباس :۔ میری محبوبہ ؟ —— کیا مطلب ہے تمہارا ؟

پرویز :۔ تمہاری تلوار ۔ جو ذرا ذرا سی بات پر میان سے اُچھل اُچھل پڑتی ہے ۔

عباس :۔ وہ زندان کے محافظوں کے پاس ہے ۔ وہ کسی شخص کو ہتھیار اندر نہیں لانے دیتے ۔ میں بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں ۔

پرویز :۔ اگر برداشت کر سکو تو یہ کھٹولا حاضر ہے اس پر بیٹھو !

عباس :۔ (بیٹھتے ہوئے) شکریہ ۔

پرویز :۔ تکلیف فرمائی کا سبب ؟

عباس :۔ پرویز ۔ میرے اجنبی دوست ۔ میں آج تم پر ایک ایسا راز منکشف کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ اگر کسی اور کو معلوم ہو جائے تو میں اپنی ہی تلوار سے اپنا کام تمام کر دوں گا ۔

پرویز :۔ لیکن میں نے تم سے یہ راز طلب نہیں کیا ۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو تم اسے اپنے پاس محفوظ رکھو ۔

عباس :۔ میں مجبور ہوں کہ تمہیں اپنا ہمراز بناؤں ۔ (دردناک لہجے میں) میں دکھی ہوں پرویز تم میری محبت کے چاند پر گہن بن کے چھا گئے ہو ۔ میں نے کانٹوں اور انگاروں پر چل کر جو تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا ۔ وہ میرے پاؤں تلے سے نکل کر میری طویل مسافت میں مل گیا ہے اور اس وقت میں اپنی منزل سے اتنا ہی دُور

ہوں ہوتا پہلے روز جب میں نے ــــ جب میں نے ــــ

پرویز :- جب تم نے ؟

عباس :- جب میں نے شاہزادی بلقیس کو دریچے میں دیکھا تھا !

پرویز :- تم نے ؟

عباس :- ہاں میں نے پرویز - اُس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا - اور شہابی رنگ کی شعاعوں نے شہزادی کے چہرے پر گلال پھیر دیا تھا - وہ مجھے ایک مجسّم شعلہ نظر آئی اور شاہزادی کے بال کھُلے تھے اور وہ افق کو تک رہی تھی - اور میں شاہزادی کو تک رہا تھا -

پرویز :- اس کے بعد ؟

عباس :- اس کے بعد مَیں نے شاہزادی کے قریب ہونا چاہا - اور ہوتا گیا - مگر اچانک کہیں سے تم آ گئے اور یوں آئے ، جیسے نو دمیدہ کلیوں کی پھلواری میں ایک بگولا گھس آئے - جیسے ننھے ننھے نقرئی چراغوں کے ہجوم میں ہوا کا ایک جھونکا ناچنے لگے -

پرویز :- میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا عباس !

عباس :- بلقیس ایک فن پرست انسان کی بیٹی ہے - اور اس نے فن کی محبت وراثت میں پائی ہے - اس نے مجھے صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ پرویز کی موجودگی میں ، تمہاری موجودگی میں ، کسی دوسرے انسان کا تصور تک بھی نہیں کر سکتی -

پرویز :- مگر میں نے تو ــــ

عباس :- ہاں ہاں - تم نے تو کچھ نہیں کیا - آپ ہی آپ ہو گیا یہ سب کچھ ـــــ لیکن پھر بھی مَیں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں - ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے مَیں تمہارے سامنے اپنا دامن پھیلاتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ تم جو، ہر انسان سے محبت کرنے کے دعویدار ہو، مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤ گے۔

پرویز :- لیکن میں کیا خدمت کر سکتا ہوں تمہاری ؟ میرے پاس یہ چند مُوقلم ہیں، یا یہ رنگوں کی پیالیاں اور ـــــ

عباس :- وعدہ کرتے ہو !

پرویز :- وعدہ کرتا ہوں -

عباس :- وہ خاکہ بادشاہ کے حوالے نہ کرنا -

پرویز :- تاکہ میں مر جاؤں اور تمہارے لئے میدان خالی کر جاؤں ؟

عباس :- نہیں ! ہمارے بادشاہ تلوار کا بہت کم استعمال کرتے ہیں - وہ تمہیں بخش دیں گے - بس اتنا ہو گا کہ وہ تمہیں مملکتِ طغزان سے باہر چلے جانے کو کہہ دیں گے - اور اس طرح میرے اجنبی دوست ـــــ میری محبت کا چاند گہن سے نکل آئے گا اور جب یوں ہو گا ـــــ [دُور سے تیز تیز پاؤں کی چاپ] اور جب یوں ہو گا ـــــ [چاپ قریب آجاتی ہے]

نوروز :- [سرگوشی میں] عباس - عباس - باہر آجاؤ - نکل آؤ باہر - ورنہ تمہارا راز فاش ہو جائے گا - شہزادی بلقیس آرہی ہیں -

عباس اور پرویز :- شہزادی بلقیس !

نوروز :- عباس کیا سوچ رہے ہو !

عباس :- (ہولے ہولے دُور جاتے ہوئے) شاہزادی بلقیس آرہی ہیں۔ یہاں! زندان میں! پرویز کے پاس! شاہزادی بلقیس!

[دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز]

پرویز :- اچھا تو بلقیس کو آخری وقت میرے پاس بھیج کر شاہِ طغران میری موت کو ایک عذاب بنانا چاہتا ہے۔

[دروازہ کھلتا ہے]

پرویز :- تشریف لایئے شاہزادی صاحبہ — آیئے! [خاموشی]

پرویز :- میں حیران ہوں کہ آپ سے اِس ٹوٹے پھوٹے کھٹولے پر بیٹھنے کے لئے کیسے کہوں؟

بلقیس :- پرویز!

پرویز :- شاہزادی!

بلقیس :- تم میرے مقروض ہو!

پرویز :- شاہزادی۔

بلقیس :- تم میرے مقروض ہو نا؟ تم نے میرے چہرے کو اپنے خاکے کا پس منظر بنایا تھا!

پرویز :- پس منظر؟ آپ کا چہرہ ہی تو تھا۔ جس نے اُس خاکے کو آسمان پر بٹھا دیا۔

بلقیس :- تو پھر تم میرے مقروض ہو نا؟

پرویز :- مقروض ہوں!

بلقیس :- میرا قرض ادا کرو!

پرویز:۔ جی!

بلقیس:۔ میرا قرض ادا کرو!

پرویز:۔ وہ کیسے!

بلقیس:۔ وہ خاکہ مجھے دے دو!

پرویز:۔ خاکہ؟

بلقیس:۔ ہاں۔ وہ خاکہ مجھے دے دو۔ کیونکہ پرویز —— پرویز (آواز بھرّا جاتی ہے) میں بھی یاد رکھوں گی۔ کہ میرے آسمانِ زندگی پر بھی ایک چاند اُبھرا تھا۔

پرویز:۔ خاکہ۔ شاہزادی؟

بلقیس:۔ میں اسے تمہاری امانت سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رکھوں گی ہمیشہ۔ کیونکہ پرویز —— تم نے —— تم نے ——

پرویز:۔ میں لٹ چکا ہوں شاہزادی!

بلقیس:۔ کیا؟

پرویز:۔ خاکہ میرے پاس نہیں!

بلقیس:۔ تمہارے پاس نہیں؟ تو پھر کس کے پاس ہے؟

پرویز:۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن مجھے دکھ ہے کہ وہ اس وقت میرے پاس کیوں نہیں۔ شاہزادی۔ تم نے خزاں سے پھول طلب کئے ہیں۔ تم نے صحرا سے پانی مانگا ہے۔

بلقیس:۔ مگر آخر کہاں ہے وہ خاکہ؟ —— وہ خاکہ جس سے مجھے تمہاری زندگی خریدنا تھی۔ جس سے مجھے اپنی امیدوں کے گلزار سجانا تھے۔ جس کے

بل بوتے پر مجھے نہیں جیتنا تھا۔ موت کے ہاتھ سے۔ بادشاہت کے ہاتھ سے — ساری دنیا کے ہاتھ سے۔

پرویز:۔ شاہزادی! — اور اب شاہزادی — !

بلقیس:۔ اور اب — [دروازہ زور سے کھلتا ہے۔ بلقیس چیخ مارتی ہے]

[خاموشی]

شاہ:۔ (گرج کر) بلقیس۔ سپنولی — کٹنی — ! تم یہاں؟ — تم یہاں؟ ہم نہیں جانتے تھے کہ ہم آستین میں سانپ پال رہے ہیں۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ جو پھول ہمارے گلزار میں کھلا ہے وہ اصل میں زہر کی پڑیا ہے۔ تم نے ہماری صدیوں کی آبرو کو مٹی میں ملا دیا۔ تم نے آلِ طغران کے ماتھے پر لعنتیں لکھ دی ہیں۔ تم نے ہمارے ناموس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

بلقیس:۔ ابّا جان! — ابّا جان — میں تو یہاں — !

شاہ:۔ ہم کچھ نہیں سننا چاہتے۔ ہم اپنی تلوار سے رعایا کے سامنے تمہاری گردن اتاریں گے۔ تاریخ بلبلا اٹھے گی۔ کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیٹی کے خون سے ہاتھ رنگ لئے اور طغرائیوں کا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا۔ کہ اُن کے ایک بادشاہ نے اُن کی آبرو اور عزّت کی قربان گاہ پر اپنی بیٹی کو بھینٹ چڑھا دیا۔

سیّاس:۔ مگر جہاں پناہ —

شاہ:۔ ہم کچھ نہیں سننا چاہتے سیّاس!

سیّاس:۔ جان بخشی چاہتا ہوں جہاں پناہ۔ شاہزادی سے زندان میں آنے کا سبب تو پوچھ لیا جائے۔

شاہ:۔ جب سورج نکل آئے تو کسی سے یہ پوچھنا کہ اِس وقت دن ہے یا رات
بچپنہ ہے۔ ہم اندھے نہیں!

سیّاس:۔ پھر بھی جہاں پناہ!

شاہ:۔ بلقیس۔ سیّاس پوچھتے ہیں تم یہاں کیوں آئیں؟

بلقیس:۔ انسانی زندگی کی قیمت مصوّری کے ایک شاہکار اور شاعری کے ایک معجزے سے کہیں زیادہ ہے جہاں پناہ۔ یہ سبق آپ ہی نے مجھے سکھایا تھا۔ اور مجھے اس بے قصور نوجوان پر رحم آیا تھا۔ اور میں اس سے التجا کرنے آئی تھی۔ کہ وہ خاکہ میرے حوالے کردے اور اپنی جوانی پر رحم کھائے۔ مَیں ایک انسان کو خودکشی سے بچانے آئی تھی ابّا جان — جہاں پناہ —!

سیّاس:۔ شاہزادی بے قصور ہے جہاں پناہ —!

شاہ:۔ وہ خاکہ کہاں ہے؟

بلقیس:۔ میرے پاس نہیں!

شاہ:۔ وہ خاکہ کہاں ہے پرویز؟

پرویز:۔ میرے پاس نہیں۔

شاہ:۔ تو پھر کس کے پاس ہے۔

پرویز:۔ مَیں نہیں جانتا۔ لیکن اگر وہ خاکہ اِس وقت میرے پاس ہوتا۔ تب بھی وہ آپ کو نہ ملتا۔

شاہ:۔ مگر وہ ہے کہاں؟

پرویز:۔ میں نہیں بتا سکتا!

شاہ:- پرویز ہم نے میان سے تلوار نکالے بغیر سلطنتیں جیتیں - ہم نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے فیصلے کئے - ہمارے ماتھے پر جب شکن آئی تو زمین کی طنابیں تن گئیں اور جب ہم نے اپنا ہاتھ اُٹھایا تو دنیا نے آسمان کے پھٹنے کی آوازیں سنیں - اور تم —— ایک آوارہ چھوکرے —— تم ہمارے مُنہ آتے ہو —— ذرّہ طوفان کا مقابلہ کرتا ہے - قطرہ سمندر سے اُلجھنے کے درپے ہے - زاغ شاہین پر جھپٹنے کو تُلا ہُوا ہے ؟ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے اور اب ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ہماری روحانی قوتیں تمہیں راہِ راست پر لانے میں ناکام رہیں - اب جسمانی طاقت تمہاری زبان سے تمام راز چُوس لے گی - (تلوار میان سے نکالنے کی آواز) اب بتاؤ وہ خاکہ کہاں ہے ؟

بلقیس:- (چیخ کر) ابا جان !

سیّاس:- تلوار ؟ شاہِ طغران کے ہاتھ میں تلوار !

شاہ:- تم خاموش رہو سیّاس - اس وقت ہمیں کسی صلاح کار کی ضرورت نہیں - ہم نہیں چاہتے کہ ایک سر پھرا چھوکرا ہمارے جاہ و جلال سے کھیلتا پھرے —— وہ خاکہ کہاں ہے پرویز ؟

پرویز:- وہ میرے پاس نہیں !

شاہ:- تو پھر کہاں ہے ؟

پرویز:- میں نہیں بتا سکتا - لیکن اگر میرے پاس ہوتا - تب بھی وہ اس ہاتھ میں نہیں جا سکتا - جس نے تلوار تھام رکھی ہے - وہ ایک اور شخصیت کا حق تھا -

جس نے اُسے تخلیق کیا۔ جس نے اس میں زندگی بھر دی۔ اور اس وقت ——

شاہ:۔ خاکہ لاؤ۔

پرویز:۔ نہیں ہے!

شاہ:۔ ہم کہتے ہیں خاکہ لاؤ!

پرویز:۔ نہیں ہے شاہ طغران!

شاہ:۔ ہم آخری حکم دیتے ہیں۔ خاکہ لاؤ!

پرویز:۔ نہیں شاہ ——

(بادشاہ کی تلوار پرویز کو دوسرا لفظ نہیں کہنے دیتی۔ اس کے گلے سے موت کی غرغراہٹ کی آواز آتی ہے اور شاہزادی زور کی چیخ مارتی ہے!)

بلقیس:۔ ابا جان! آپ قاتل ہیں۔ آپ خونی ہیں۔ آپ ——

(بہت سے قدموں کی چاپ۔ جو بھاگتے ہوئے آتے ہیں)

عباس:۔ عالی جاہ —— عالی جاہ۔ شاہ غاسان کا ایلچی ابھی ابھی آیا ہے یہ صندوقچہ لئے۔ وہ اِتنی تیزی سے آیا ہے کہ جب اس نے گھوڑے کو روکا۔ تو لڑھک کر دُور جا گرا اور خود اس کا جسم ٹھنڈے پسینے سے شرابور ہو رہا ہے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ شاہِ غاسان کا پیغام پہنچانے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہ ہو۔

شاہ:۔ ستیاس! اِسے کھولو۔ اور بتاؤ کہ وہ کیا کہتا ہے۔

عباس:۔ پرویز! پرویز کو کس نے ذبح کر دیا۔ کس نے مارا ہے پرویز کو؟ میں پوچھتا

ہوں کون قاتل ہے پرویز کا ؟

سیّاس :۔ خاموش رہو عباس ــــ عالیجاہ نے خود ــــ (انتہائی حیرت سے) ارے!
ــــ جہاں پناہ یہ دیکھئے، یہ دیکھئے!

شاہ :۔ وہی حیران چہرے کا خاکہ! یہ کیا ہو رہا ہے۔ کائنات گھومنے لگی ہے۔ ہماری آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں۔ ہمیں تھامو۔ ہمیں تھامو!

بلقیس :۔ ابّا جان!

سیّاس :۔ شاہ غاسان لکھتے ہیں عالی جاہ :۔
شاہ طغران نے صوبۂ ریاض کا فیصلہ کرنے کے لئے ہم سے فنّی مقابلے کی ٹھانی۔ شاید شاہ طغران کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں کے مُوقلم تلواروں کے سائے میں پروان چڑھے ہیں۔ اور اسی لئے ہم نے اپنے ایک نوجوان مصوّر پرویز کو ایک آوارہ فن کار کی صورت میں مملکتِ طغران میں بھیجا ہے۔ جس نے شاہ طغران پر فنی فتح حاصل کی۔ اس کا ثبوت ہم اس نامہ کے ساتھ بھجوا رہے ہیں اور شاہِ طغران کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ہمارے فاتح کو زندان سے آزاد کر کے صوبہ ریاض پر سے حریصانہ نگاہیں اُٹھا لے!

بلقیس :۔ (چیخ کر) ابّا جان! ــــ ابّا جان!

سیّاس :۔ کیا ہو گیا جہاں پناہ کو؟

شاہ :۔ (انتہائی ماندگی سے) شاہِ غاسان نے ہمارے منہ پر ایک زنّاٹے کا تھپڑ مارا ہے۔ اور خود اس سحر کار، اس جادوگر مصوّر کی جان لے کر ہم نے اپنی ہی انسانیت کا منہ نوچ لیا ہے۔ ہم شکست خوردہ ہیں۔ ہمارا فن شکست خوردہ

ہے۔ ہماری بادشاہت شکست خوردہ ہے۔ ہماری آدمیت شکست خوردہ ہے۔

[تھکی ہوئی سانسیں]

نوروز :۔ جہاں پناہ کا غلام نوروز اپنے شہنشاہ سے پرویز کی میت کی بھیک مانگتا ہے۔

شاہ :۔ پرویز کو شاہی قبرستان میں ہمارے پہلو میں دفن کیا جائے۔

بلقیس :۔ ابا جان! (روتی ہے)

شاہ :۔ اب ہم تھک چکے ہیں۔ اپنے ہی ارادوں اور تمناؤں کی لاشوں کے بوجھ سے ہماری کمر ٹوٹ چکی ہے۔ ہم پر فن اور اس کی عظمت کا سورج غروب ہو چکا ہے۔ ہماری زندگی کی رات رینگتی چلی آ رہی ہے۔ جھٹپٹے سے پہلے ہمیں وہ خاکہ دکھاؤ — کہاں ہے وہ خاکہ؟

بلقیس :۔ یہ آپ کے سامنے ہے ابا جان!

شاہ :۔ اسے قریب لاؤ — اور قریب لاؤ — قریب لاؤ —

[ساز کے دردناک سُر ابھر کر ہولے ہولے مدھم پڑتے ہوئے رُک جاتے ہیں — !]

ستمبر ۵۲ء

قاضی محمد شریف کاتب